دُرِ دریائے غزل

باقر زیدی

Dur-E-Darya-E-Ghazal

A Book of Urdu Poetry

By

Baquer Zaidi

All Rights Reserved

First Edition : 2010
Copies : 500
Printers: Hafiz Jameel Printers, Lahore
(Pakistan)

Published By
Amber Hani Zaidi

7500 Cavan Court, Laurel, Maryland
20707-6875, USA
Phone: (301) - 617 – 9927
Cell: (301) - 395 – 7904
Price: Pak Rs. 400.00
$ 15.00

Other books by author,

Lazzat-e-Guftaar 1977
Furaat-e-Sukhan 2004
Hurmat-e-Harf 2008

انتساب

اُس بے پناہ حُسن کے نام
جس کی بُوقلمونیاں
خالقِ کائینات کے احسن الخالقین ہونے کا
ادراک بخشتی ہیں

اپنی بات

''لذتِ گفتار'' ''فراتِ سخن'' اور ''حرمتِ حرف'' کے بعد ''دُرِ دریائے غزل'' شائقینِ ادب کی خدمت میں حاضر ہے۔ میں نے اپنی 23 سالہ شاعری کی عمر میں جو کچھ لکھا ہے' الحمدللہ منظرِ عام پر آ گیا۔ جو میرے کلام کے قامت و اعتبار کو متعین کرنے کے لیے کافی ہے۔ چونکہ شاعری پچاس سال کی عمر ہونے پر شروع کی اس لیے بہت کم مدت میں بہت زیادہ لکھا' وہ بھی بغیر کسی استاد کی سرپرستی کے۔ اپنی علمی استعداد سے کوشش ضرور کی کہ لفظ کے انتخاب اور استعمال کا حق ادا ہو' لفظ و معنی کی تصویر کشی میں جدت کے ساتھ روایت کے رنگوں کو بھی بھرپور طریقے سے برتنے کی کوشش کی کہ بزرگانِ ادب سے بھی رشتہ برقرار رہے۔

اب سے 74 سال قبل 1936ء میں 26 ستمبر کو صبح کی نماز کے وقت ریاست بھرت پور کے سادات کے ایک معزز گھرانے میں آنکھ کھولی۔

پیدا ہوا تو خیر سے عالی نسب ملا
وہ نسبتیں ملیں کہ شرف کا سبب ملا
ماحول میں بسا ہوا ذوقِ ادب ملا
عالی منش گھروں سے جو ملتا ہے' سب ملا
اسلاف رہروانِ رہِ مستقیم تھے
رہتا خموش کیوں مرے دادا کلیم تھے

42 سال کراچی میں گزار کو 1990ء میں امریکہ آ گیا اور 20 سال سے یہیں مقیم ہوں۔

اس کتاب کی اشاعت میں اپنے محترم دوست جناب شکیل آزاد (امریکہ) اور جناب عابد جعفری (کینیڈا) کے پرخلوص تعاون کا بے حد مشکور ہوں۔ اللہ انہیں تندرست و خوشحال رکھے۔ جناب ظفر اقبال اور باقی احمد پوری کا بھی ممنون ہوں کہ ان کے الفاظ بھی دریائے غزل میں موتیوں کی طرح چمک رہے ہیں۔

والسلام

باقر زیدی

۱۷ اپریل ۲۰۱۰ء' کراچی

ترتیب

○ دُعا	۱۱
○ شب تاریک ہے، خاموشی ہے، تنہائی ہے	۱۴
○ اہلِ دل کی دُنیا میں ایسے لوگ اب بھی ہیں	۱۵
○ کسی بھی فن میں گو کامل نہیں ہوں	۱۷
○ تضادِ ذات کا حامل ہوں میں بھی	۱۸
○ ثنائے حُسنِ رُخِ نو دمیدہ کرتے ہیں	۲۰
○ علم کی بات جہاں تک ہوگی	۲۲
○ اک سُلگتا سا مکاں یاد آیا	۲۳
○ اپنے قد سے جو کہیں کم نہیں ہونے پاتے	۲۵
○ یہ جو دن رات خوف جان کا ہے	۲۷
○ جو سمجھنا تھے مجھے، وہ بھی کہاں سمجھا تھا میں	۲۸
○ نہیں تھکتی خدا کا شکر کرنے سے زباں میری	۳۱
○ رنجشیں ہم سے جو دن رات لیے بیٹھے ہیں	۳۳
○ محافظ قتل کے خوگر بنے ہیں	۳۶
○ جب سے کسی حسیں کی عنایت نہیں رہی	۳۸
○ جینا خوشی کے ساتھ نہ مرنا خوشی کے ساتھ	۴۰
○ جو اہلِ دل ہیں آلِ پیمبرؐ کے ساتھ ساتھ	۴۲
○ غم ہی نہیں ملے کہ مسرت نہیں ملی	۴۴
○ قلم کا قرض چکائیں، لکھیں سخن کچھ اور	۴۶
○ عجیب شہر کے منظر دکھائی دیتے ہیں	۴۸
○ جب نگاہوں میں بات ہوتی ہے	۵۰
○ حُسن پر حُسنِ نظر رکھتے ہیں	۵۱
○ دانا ہیں، حسینوں سے جواں بن نہیں رکھتے	۵۳
○ کچھ نئے حرف لکھوں، کوئی نئی بات کروں	۵۵
○ نہ ڈگمگا کے چلے اور نہ لڑکھڑا کے چلے	۵۷

کب اُس سے بڑھ کے کوئی فصاحت شِعار ہے	۵۹
یہ آشنا کا ہے، نہ کسی اجنبی کا ہے	۶۱
اللہ اللہ! چاہتیں اُس کی	۶۳
جو محبت سے بلاتا ہے، چلا آتا ہوں	۶۷
کسی فضا، کسی تہذیبِ بام و در میں رہے	۶۹
جو کہتے ہیں کہ ہم انسانیت سے پیار کرتے ہیں	۷۱
بے آس کوئی ہو تو کرم کیا نہیں رکھتے	۷۳
حُسن سے رسم و راہ ڈھونڈتے ہیں	۷۵
ہر گھڑی منظر سہانا چاہیے	۷۷
تم ہوئے جب سے مہربان میاں!	۷۹
حُسن کا ہر اک جلوہ دیکھا	۸۳
کسی کی پُشت پہ ہم چھپ کے وار کیا کرتے	۸۶
جلوہ گر طینتِ فاضل میں اثر کس کا ہے	۸۸
دل، دل سے ملانے میں مزا آتا ہے	۹۰
حُسن جب دل پذیر ہوتا ہے	۹۲
دائی اچھی نہیں ہے، عارضی اچھی نہیں	۹۴
دیارِ درد سے وہ کیوں نہ شاد کام آئے	۹۵
خوش بدن جب کوئی دیکھا ترے پیکر کی طرح	۹۷
سڑکوں پہ نظر آتے ہیں چلتے ہوئے گھر بھی	۹۹
جو محبت کی جان ہوتے ہیں	۱۰۲
جو خوش لباس بدن منظروں میں رکھے ہیں	۱۰۴
حُسن سے رسم و راہ کوئی نہیں	۱۰۶
جُز حُسن کسی شے کی تمنا نہیں کرتے	۱۰۹
اُن سے دادِ وفا جو پائی ہے	۱۱۱
تری نظر کا کرشمہ، ترے شباب کا جوش	۱۱۳
شاعر سب کا دُکھ اپنائے پھرتا ہے	۱۱۵
اِدھر اُدھر سے بھٹک کر کدھر گیا ہوں میں	۱۱۸
حاصل جو حسینوں کی رفاقت نہیں ہوتی	۱۲۱

ہم تو چاہیں ہیں بہت، وہ یہ مگر کب چاہے	۱۲۴
کسی کی مہر میں تھا اور کسی کے قہر میں تھا	۱۲۶
بزمِ ناز سے اپنی جب کوئی اُٹھاتا ہے	۱۲۸
کب محبت کی جستجو نہ رہی	۱۳۰
کسی طرح تو محبت کی ترجمانی ہو	۱۳۲
باقر صاحب لاکھ چھپائیں دل میں کچھ ہیجان تو ہے	۱۳۳
یہی آرزو، یہی جستجو، کبھی ہم کلام کوئی تو ہو	۱۳۵
جب نظرِ حُسن رسا ہوتی ہے	۱۳۷
دستِ محبوب سے کب رنگِ حنا مانگتے ہیں	۱۳۹
ہوگی اس کو بھی ہم سے چاہ بہت	۱۴۱
جب بھی منہ کھولو	۱۴۳
مرد و زن کولھو میں پلوائے گئے	۱۴۴
کسی سے دل لگاؤ تو	۱۴۵
قد قیامت، بدن بلا کا ہے	۱۴۴
دارِ رنج و محن بلا کا ہے	۱۴۷
دل کہیں مبتلا نہیں ملتا	۱۴۸
عقل نے کچھ مری مدد ہی نہ کی	۱۴۹
کچھ اور کام نہیں ہے، چلو غزل ہی کہیں	۱۵۰
کسی کا عہدِ رفاقت وفا ہوا ہی نہیں	۱۵۲
خلقت پہ ستم اور کوئی پل ہوگا	۱۵۴
رِند بھی مقتدر نہ تھا اِتنا	۱۵۶
وقفِ فریاد بھی نہیں رہتا	۱۵۸
قصہ کسی کا ہم نے سنایا کسی کو تھا	۱۶۰
اپنی محرومی کا ماتم تھا، گلہ ہی کیا تھا	۱۶۲
جو بھلا تھا، اُسے بھلا سمجھے	۱۶۴
بجھے چراغ جلانا اُسی کو آتا ہے	۱۶۷
یہ زحمت بھی کبھی فرمایئے گا	۱۷۰
کرتے ہو شکایتیں سبھی کی	۱۷۲

حال ناساز گار بھی تو نہیں	۱۷۴
دل سے دل کو ملایئے صاحب!	۱۷۶
ہم نے بھی اک کام کیا ہے	۱۷۹
کیا عجب بات ہوگئی سائیں!	۱۸۲
موسموں کی تبدیلی، جس کی دسترس میں تھی	۱۸۵
انسان کی حیات میں عرصہ قرار کا	۱۸۷
کچھ محبت کا مان چاہتی ہے	۱۸۹
میرے دل، میری جان میں آیا	۱۹۲
تنگ ہیں اپنے ہی کلام سے ہم	۱۹۵
جب محبت کے سلسلے نکلے	۱۹۷
خالقِ حُسن کی نعمت کے طلب گار ہیں ہم	۱۹۹
اب تو ایسی کوئی گھڑی آئے	۲۰۱
خواب ملتے نہیں جب وقت کی تعبیر کے ساتھ	۲۰۴
جب حُسنِ طلب لذتِ گفتار میں رکھنا	۲۰۶
ترس رہی تھی جبیں سنگِ آستاں کے لیے	۲۰۸
بہت دنوں سے کوئی دل کی دھڑکنوں میں نہیں	۲۱۰
اُس کی چاہت کا اثر اچھا لگا	۲۱۱
جس کی قربت کا مرے قلب میں ارماں ہے بہت	۲۱۲
شہر ایک ایسا دیکھا ہم نے جس میں تھے بازار بہت	۲۱۵
خود اَجل زیست کی حفاظت ہے	۲۱۷
متفرق اشعار	۲۱۸
قطعات	۲۲۴
صد پارہ ہائے دل	۲۲۹
تمام شب	۲۳۲
آنکھیں	۲۳۵
آہ ڈاکٹر سیّد علی مومن	۲۳۷
وطن	۲۴۰
قطعۂ تاریخ (احمد فرازؔ کی وفات پر)	۲۴۰

دُعا

مری فکر سب سے جدا رہے مجھے اور حرف و خیال دے
یہ سخنوروں کی جو بھیڑ ہے، مجھے بھیڑ میں سے نکال دے

ہوں طلب میں جن کی صداقتیں، اُنھیں بخش دے یہ رفاقتیں
جو ہوئے فراق سے جاں بلب، اُنھیں وصل کے مہ و سال دے

تری نعمتوں کی تو حد نہیں، تو رحیم ہے تو کریم ہے
مرے ظرف سے جو سوا نہ ہو اُسے میری جھولی میں ڈال دے

وہی شخص سب سے بلند ہے، وہی میرے رب کو پسند ہے
جو کسی یتیم کو پال دے، کسی ڈوبتے کو اچھال دے

مری گفتگو میں وہ قند ہو، جو سماعتوں کو پسند ہو
وہی جذب مجھ کو بھی کر عطا جو اذاں کو صوتِ بلال دے

یہ جو 'ظ' 'ز' و 'ض' ہیں، یہ صدا و صوت میں ایک ہیں
یہ مری زبان کا ظرف ہے مجھے ذائقہ کو جو ذال دے

۲

مری شاخِ فکر کے پھول ہوں، مرے حرف حرفِ قبول ہوں
وہ مرے قلم کو عروج ہو کہ زمانہ میری مثال دے

جو مرا چلن ہے وہی رہے ، ہو کبھی غرور نہ تمکنت
جو فِروتنی سے جدا لگے مرے عجز کو وہی چال دے

یہ سخنوروں کی سیاستیں ، یہ غلاظتوں کی ملاوٹیں
مجھے اِن جھمیلوں سے دور رکھ، مجھے مخمصوں سے نکال دے

جہاں بام و در میں ہو خامشی، جہاں خوفِ جاں کا سکوت ہو
جہاں حرفِ حق نہ کہے کوئی ، وہاں مجھ کو اذنِ مَقال دے

ہے عبادتوں کا غرور ہی ، نہ دعا کا مجھ کو شعور ہی
مری اور کوئی طلب نہیں ، مجھے اپنی راہ پہ ڈال دے

نہ میں جوشؔ و غالبؔ و میرؔ ہوں، نہ انیسؔ ہوں نہ دبیرؔ ہوں
میں رہِ سخن کا فقیر ہوں ، مجھے کچھ سبیلِ کمال دے

وہ جو تیرا احسنِ خلق ہے، مجھے اُس کی نعت کا دے ہنر
ترا وصف حُبِ جمال ہے، مرے فکر و فن کو جمال دے

کبھی مال و زر پہ رہے نظر، نہ کسی کا حق کوئی غصب ہو
کسی راستے کی طلب نہیں، مجھے قالبِ فقر میں ڈھال دے

مرے بازوؤں میں سکت رہے، کہ جو چاہتا ہوں وہ کر سکوں
کوئی کام مجھ سے بھی ایسا ہو، کہ زمانہ جس کی مثال دے

○

شبِ تاریک ہے، خاموشی ہے، تنہائی ہے
ایسے عالم میں کہاں یاد تری آئی ہے

چند لمحوں میں ہمیں کرلیا جس نے اپنا
اُس نے ہم ہی سے نہ ملنے کی قسم کھائی ہے

کِن غریبوں کا لہو تھا جو اُفق پر ابھرا
یہ جو سرخی سی سرِ شام نظر آئی ہے

آپ سے کیا کہیں ہم حُسن کی قامت کیا ہے
آخرِ شب میں جو ٹوٹی ہے وہ انگڑائی ہے

جِس کو چاہا، جِسے سوچا، جسے لکّھا باقر
دِلِ ناکام اُسی کا تو تمنّائی ہے

(۱۲۰پریل ۱۹۸۷ء بمقام کوئٹہ)

○

اہلِ دل کی دنیا میں ایسے لوگ اب بھی ہیں
بے قصور ہیں لیکن معذرت طلب بھی ہیں

ملتِ موحد میں ہم عجم عرب بھی ہیں
نفرتیں بھی کرتے ہیں چاہتوں کے ڈھب بھی ہیں

اک نظر توّجہ کی ، بول دو محبت کے
قریۂ تمنّا میں ہم سے کم طلب بھی ہیں

وقت کے اندھیروں سے واسطہ تو رہتا ہے
روشنی کے شہروں میں کچھ سفیرِ شب بھی ہیں

جو لہو رگوں میں ہو رنگ تو دکھاتا ہے
اِس سبب کی دنیا میں کچھ حسَب نسَب بھی ہیں

ہم وطن میں رہ کر بھی بے وطن سے تھے لیکن
تیرے جاں نثاروں میں اے وطن ہم اب بھی ہیں

جن سے نوعِ انساں کا اعتبار قائم ہے
آبجوئے ہستی میں ایسے تشنہ لب بھی ہیں

عمر کے گزرنے پر بے توجہی کیوں ہے
ہم تو چاہنے والے جب بھی تھے اور اب بھی ہیں

ہر قلم تو اے باقرؔ معتبر نہیں ہوتا
اِس سخن کی دنیا میں لوگ کچھ عجب بھی ہیں

○

کسی بھی فن میں گو کامل نہیں ہوں
مگر میں سعیِ لا حاصل نہیں ہوں

الگ ڈھونڈا ہے میں نے اپنا رستہ
کسی کی راہ میں حائل نہیں ہوں

بنی تھی جو مرا ہی نام لے کر
اُسی فہرست میں شامل نہیں ہوں

یقیں ہے کاتبِ تقدیر پر بھی
نِری تدبیر کا قائل نہیں ہوں

ابھی گرداب میں ہے میری کشتی
ابھی آسودۂ ساحل نہیں ہوں

بہاروں کی تمنّا کررہا ہوں
خِزاں کے حسن پر مائل نہیں ہوں

گزر جائیں گے مجھ تک آنے والے
میں رستہ ہوں کوئی منزل نہیں ہوں

وہ قدریں مشترک ہوں گی تو کیسے
میں جن اقدار کا حامل نہیں ہوں

بڑی آسانیاں ہیں میرے دم سے
کسی مشکل میں، میں مشکل نہیں ہوں

بہت سادہ مرا طرزِ سخن ہے
مثالِ حضرتِ بیدلؔ نہیں ہوں

نہیں ہوں پیار کے قابل اگر میں
تو کیا نفرت کے بھی قابل نہیں ہوں

مرے اندر بھی نورِ امرِ رب ہے
فقط تصویرِ آب و گِل نہیں ہوں

نہ تڑپے جو مصیبت میں کسی کی
خدا کا شکر میں وہ دل نہیں ہوں

قلم کا قرض ہے مجھ پر بھی باقرؔ
میں اپنے فرض سے غافل نہیں ہوں

○

تضادِ ذات کا حامل ہوں میں بھی
کہیں طوفاں، کہیں ساحل ہوں میں بھی

سبھی کے درد میں شامل ہوں میں بھی
تو گویا اک مجسم دل ہوں میں بھی

نہیں آساں یہاں عزت سے جینا
بہت تحسین کے قابل ہوں میں بھی

مرے دم سے ہے نظمِ بزمِ ہستی
شریکِ گرمیِ محفل ہوں میں بھی

کبھی آسانیاں ہیں میرے دم سے
کبھی سب سے بڑی مشکل ہوں میں بھی

سکوں پاتے ہیں مجھ تک آنے والے
بڑی آسائشِ منزل ہوں میں بھی

مرا رستہ بھی کوئی روکتا ہے
کسی کی راہ میں حائل ہوں میں بھی

یہ نسلِ نو اگر نامطمئن ہے
تو اپنے فرض سے غافل ہوں میں بھی

پیالہ زہر کا پینا پڑے گا
شعارِ صدق کا قائل ہوں میں بھی

وہ باقرؔ جس سے سب کو مل رہا ہے
اُسی دہلیز کا سائل ہوں میں بھی

○

ثنائے حُسنِ رُخِ نودمیدہ کرتے ہیں
ہم آپ اپنی غزل کو قصیدہ کرتے ہیں

ہر ایک کو نہیں ملتی طہارتِ افکار
سو احترامِ نبیؐ خوش عقیدہ کرتے ہیں

ہم اہلِ ظرف ہیں جھکتے ہیں مثلِ شاخِ ثمر
معانقوں میں کمر کو خمیدہ کرتے ہیں

یہ دل ہر اک کی مصیبت کے دُکھ اُٹھاتا ہے
سبھی کے اشک ہمیں آبدیدہ کرتے ہیں

اُسی نظر سے زمانہ انھیں بھی دیکھتا ہے
جو بات بات پہ ابرو کشیدہ کرتے ہیں

خدا کرے کہ غلط ہو مگر سُنا ہے کہ اب
گلوں کا خون چمن آفریدہ کرتے ہیں

پری وشوں سے ہو نسبت تو اہلِ حرف و خبر
ذرا سی بات کو مثلِ جریدہ کرتے ہیں

برہنہ ظلم کو دیتے ہیں مصلحت کا لباس
یہ کام طفلِ نہیں، سِن رسیدہ کرتے ہیں

وہ وصف بزمِ حسیناں میں عیب کی ہیں مثال
حرم میں شیخ کو جو برگزیدہ کرتے ہیں

یہ امتیاز بھی اہلِ قلم کو حاصل ہے
کہ ناشنیدہ کو مانندِ دیدہ کرتے ہیں

اب اہلِ حُسن اداؤں کی بارشیں کرکے
جو پُرشکم ہیں انھیں بھی ندیدہ کرتے ہیں

○

علم کی بات جہاں تک ہوگی　　بارشِ نور وہاں تک ہوگی
حُسن کی بات جہاں تک ہوگی　　گفتگو صرف وہاں ہوگی
ذکر میرا بھی کہیں آئے گا　　بات اُن کی ہی کہاں تک ہوگی
روشنی مہرِ یقیں لائے گا　　تیرگی، وہم و گماں تک ہوگی
کس کو ممتا کی کوئی تھاہ ملے　　کون جانے کہ کہاں تک ہوگی
نہ تھکے وہ نہیں ناہیں کہتے　　یہ نہیں بھی کبھی ہاں تک ہوگی
ڈھلتے دیکھے ہیں بدن زاویوں میں　　یہ نمائش بھی کہاں تک ہوگی

نہ سہی میں ، یہ غزل تو میری
لبِ شیریں دہناں تک ہوگی

○

اک سلگتا سا مکاں یاد آیا
شعلے یاد آئے، دھواں یاد آیا

وہ بچھڑنے کا سماں یاد آیا
دیکھیے کون کہاں یاد آیا

کوچۂ ماہ وشاں یاد آیا
قندِ شریں دہناں یاد آیا

یہاں یاد آیا، وہاں یاد آیا
تو ہی یاد آیا، جہاں یاد آیا

جب کہی ہم نے کوئی تازہ غزل
حلقۂ ہم سخناں یاد آیا

سوتے سوتے وہ سکوتِ شب میں
یک بیک شورِ اذاں یاد آیا

پھر مری آنکھوں سے چشمے پھوٹے
پھر کوئی تشنہ دہاں یاد آیا

دل پہ کیا گزری نہ پوچھو ہم سے
جب کوئی راحتِ جاں یاد آیا

○

اپنے قد سے جو کہیں کم نہیں ہونے پاتے
کسی ماحول میں ہم ضم نہیں ہونے پاتے

وہ کہیں اور کہیں ہم نہیں ہونے پاتے
سو یہ صورت ہے کہ باہم نہیں ہونے پاتے

رفتہ رفتہ سہی، کھو دیتے ہیں اک روز شناخت
وہ قبیلے جو منظّم نہیں ہونے پاتے

رسم یہ اپنے ہی گھر سے تو چلی ہے جہاں سر
کٹ تو جاتے ہیں مگر خم نہیں ہونے پاتے

ٹوٹ بھی جاتے ہیں مٹّی کے کھلونوں کی طرح
سب ارادے تو مجسّم نہیں ہونے پاتے

مرگِ انبوہ میں جشنوں کا سماں ٹھیک نہیں
لوگ شائستۂ ماتم نہیں ہونے پاتے

اور اک گھاؤ نیا گھاؤ پہ لگ جاتا ہے
زخم منّت کشِ مرہم نہیں ہونے پاتے

کسی فنکار کی خیرات پہ پلنے والے
کبھی میدان کے رُستم نہیں ہونے پاتے

ایک ہی قسم کی اُفتاد کے مارے ہوئے لوگ
ایک ہو سکتے ہیں تاہم نہیں ہونے پاتے

اُن کے افکار پہ قدغن نہیں ہوتی کوئی
وہ جو وارفتۂ درہم نہیں ہونے پاتے

ایک ہی پیڑ کی شاخوں پہ پنپتے پتّے
جب بکھرتے ہیں تو باہم نہیں ہونے پاتے

○

یہ جو دن رات خوف جان کا ہے　　وقت صحراؤں میں اذان کا ہے
بوجھ کاندھوں پہ اک جہان کا ہے　　ہاں یہی وقت امتحان کا ہے
سب جو کرتے ہیں میں نہیں کرتا　　یہ اثر مجھ میں خاندان کا ہے
میں بھی کردار ہوں فسانے کا　　لطف مجھ سے بھی داستان کا ہے
مجھ کو آتے ہیں عشق کے آداب　　قیس میرے ہی خاندان کا ہے
کسی گھر میں برس رہا ہے ہُن　　کوئی محتاج ایک نان کا ہے
ہر برس آرزوئے خوش حالی　　اور کیا فصل میں کسان کا ہے
کم سے کم ذکر تو سیاست میں　　روٹی، کپڑے کا اور مکان کا ہے
قابلِ دید ہے اُسی کی چمک　　ہیرا جو کوئلے کی کان کا ہے

ذہنِ باقرؔ ہے ہر گھڑی بے چین
کب کوئی وقت اطمینان کا ہے

○

جو سمجھنا تھا مجھے ، وہ بھی کہاں سمجھا تھا میں
اور سمجھتا تھا کہ سب کارِ جہاں سمجھا تھا میں

جس کو جاں سمجھا تھا ، جس کو جانِ جاں سمجھا تھا میں
کچھ "نہیں" سمجھا تھا اُس کی اور نہ "ہاں" سمجھا تھا میں

ہر کسی نامہرباں کو مہرباں سمجھا تھا میں
دارِ دہشت تھا جسے دارالاماں سمجھا تھا میں

اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا مگر میرا نہ تھا
ایک مدّت تک جسے اپنا مکاں سمجھا تھا میں

دیر سے آیا مگر آخر سمجھ میں آ گیا
میری نا سمجھی تھی جو مٹّی کو ماں سمجھا تھا میں

کچھ بلندی سے جو دیکھا ہے تو آنکھیں کُھل گئیں
کیسی کیسی پستیوں کو آسماں سمجھا تھا میں

کیا کٹھن منزل تھی راہِ اعتبارِ دوست کی
وہ وہاں سے اور آگے تھا جہاں سمجھا تھا میں

پھر جبینِ شوق اُس چوکھٹ سے اُٹھی ہی نہیں
لائقِ سجدہ جو سنگِ آستاں سمجھا تھا میں

اُس کے پیچھے تھا تو مجھ کو بھی بھٹکنا ہی پڑا
پیش رو کو اپنے ، میرِ کارواں سمجھا تھا میں

تھا مرا بھی اور میرے دشمنوں کا دوست بھی
اور کوئی کیا سمجھتا اُس کو ، ہاں سمجھا تھا میں

تھیں اُسی پیکر میں پنہاں رفعتیں انسان کی
وہ بدن جس کو ہوس کی اک دُکاں سمجھا تھا میں

نبضِ ہستی میں رواں ہے صنفِ بہتر کا لہو
داستاں ہے جس کو زیبِ داستاں سمجھا تھا میں

اِس ردیفِ شعر پر عورت غزل کیسے کہے
اِس 'طرح' کو اِس لیے ایذا رساں سمجھا تھا میں

(۵۸ویں سالگرہ کے موقع پر ۱۹۹۴ء)

○

نہیں تھکتی خدا کا شکر کرنے سے زباں میری
مری محرومیوں سے بچ گئیں خودداریاں میری

نہ جانے کتنے سورج دھوپ بن کر مجھ پہ اُترے ہیں
فرازِ سینۂ گیتی پہ ہیں پرچھائیاں میری

بِنا میرے ، تری فہرستِ خلقت نامکمل تھی
ضرورت تھی تجھے بھی اے فضائے کُن فکاں میری

مہکتا ہے چمن میرے لہو کی آبیاری سے
مگر نظمِ گُلستاں میں نہیں میری نہ 'ہاں' میری

مزاج یار بھی کچھ حضرتِ واعظ سے ملتا ہے
سب اپنی ہی کہے جاتا ہے سنتا ہے کہاں میری

سکت سے بڑھ کے عادت ہوگئی ہے بوجھ اُٹھانے کی
مجھے تھکنے نہیں دیتی ہیں ذمہ داریاں میری

میں کب سے منتظر بیٹھا ہوں اُن قدموں کی آہٹ کا
وہ جانِ آرزو آئے تو آئے جاں میں جاں میری

جو مجھ پر آن پڑتی ہے ہمیشہ جھیل لیتا ہوں
شکایت سے کبھی واقف نہیں ہوتی زباں میری

نئے ماحول کے شوریدہ ہنگاموں کے جنگل میں
کوئی سنتا بھی کیسے ایک آوازِ اذاں میری

زبانِ یارِ مَن تُرکی و مَن تُرکی نہ می دانم
نہ میں سمجھوں زباں اُس کی نہ وہ سمجھے زباں میری

بہت ہی مختلف سب سے مرا مالِ تجارت ہے
سو اِس بازار میں تو چل نہ پائے گی دکاں میری

انیسؔ و میرؔ و غالبؔ کے چمن کا آفریدہ ہوں
مجھے بھی فخر ہے باقرؔ کہ ہے اردو زباں میری

○

رنجشیں ہم سے جو دن رات لیے بیٹھے ہیں
بات کچھ بھی نہیں بے بات لیے بیٹھے ہیں

نقطہ ٔ دائرہ ٔ ذات لیے بیٹھے ہیں
لوگ اپنے ہیں مفادات لیے بیٹھے ہیں

جہاں بنیادِ شرف نام و نسب کچھ بھی نہیں
ہم وہاں عزّت سادات لیے بیٹھے ہیں

اہلِ تدبیر نے ڈالی مہ و اختر پہ کمند
ہم تو امیدِ کرِشمات لیے بیٹھے ہیں

بس وہی لوگ تو خوش وقت بھی ٹھہرے ہیں کہ جو
نظمِ پابندیِ اوقات لیے بیٹھے ہیں

کل یہی لوگ تھے دکھ درد کے ساتھی میرے
جو کمیں گاہ میں ہیں گھات لیے بیٹھے ہیں

ایک تم ہو کہ کہے بول بھلا دیتے ہو
ایک ہم ہیں کہ وہی بات لیے بیٹھے ہیں

جوش سی جرأت اظہار کہاں سے لائیں
ہم بھی اِک ''یادوں کی بارات'' لیے بیٹھے ہیں

رہنماؤں کا کرم ہے کہ مرے ملک کے لوگ
کربِ بے رحمیِ حالات لیے بیٹھے ہیں

وہ کہیں حضرتِ یوسفؑ کے برادر تو نہیں
جن سے ہم عہدِ مواخات لیے بیٹھے ہیں

قابلِ ذکر تو ہر شعر نہیں میرؔ کا بھی
سب ہی تھوڑی سی خُرافات لیے بیٹھے ہیں

کیا کبھی ڈالیں گے اپنے بھی گریباں پہ نظر
جو زمانے کی شکایات لیے بیٹھے ہیں

عالمِ ہست میں مٹّی بھی نہیں ہے کم تر
کتنی طاقت ہے جو ذرّات لیے بیٹھے ہیں

اب بھی کمزور کو جینے نہیں دیتی دنیا
لوگ کہنے کو مساوات لیے بیٹھے ہیں

اب بھی دن رات تلَف ہوتے ہیں لوگوں کے حقوق
آپ قانون کی دفعات لیے بیٹھے ہیں

○

مُحافظ قتل کے خُوگر بنے ہیں
تو پھر کٹنے ہی کو یہ سر بنے ہیں

محبت کے جو بام و در بنے ہیں
ہمیں بنیاد کا پتھر بنے ہیں

اُنھیں بھی تو گلہ ہے بے گھری کا
جو گھر ہوتے ہوئے بے گھر بنے ہیں

کہیں شر سے مَفَر ممکن نہیں ہے
بہم رہنے کو خیر و شر بنے ہیں

مزاجِ حُسن تزئین و نمائش
نگاہوں کے لیے منظر بنے ہیں

یہ قتل و خوں جو ہے اِس گھر کے اندر
یہ منصوبے کہیں باہر بنے ہیں

ہماری داستانِ عشق کیا تھی
ذرا سی بات کے دفتر بنے ہیں

محبت سے بھی خوں ہوتا ہے اکثر
مروّت کے بھی کچھ خنجر بنے ہیں

ہے گردش ہی سے ساری ظرف کاری
کہ برتن چاک پر پھر کر بنے ہیں

تضادِ جنس کا کچھ تو سبب ہے
کہ مادہ ہی کی خاطر نَر بنے ہیں

کچھ ایسا شوق ہے غارت گری کا
بنامِ امن بھی لشکر بنے ہیں

○

جب سے کسی حسیں کی عنایت نہیں رہی
وہ دل نہیں رہا ، وہ طبیعت نہیں رہی

چھوٹوں پہ شفقتیں جہاں نا پید ہوگئیں
اُس گھر میں پھر بزرگوں کی عزّت نہیں رہی

یاروں نے اعتماد کو توڑا ہے اِس طرح
اب آبروئے اہلِ سیاست نہیں رہی

کب گھر کی دیکھ بھال کا آیا ہمیں خیال
جب گھر کی کوئی چیز سلامت نہیں رہی

اُس شہرِ نا مراد سے نسبت ہوئی جہاں
باقی رفاقتوں کی روایت نہیں رہی

یا دوپہر کی دھوپ کے عادی ہوئے بدن
یا آفتاب ہی میں تمازت نہیں رہی

بزمِ سخن میں اہلِ غزل جانِ بزم ہیں
کس دور میں غزل کو فضیلت نہیں رہی

گلشن میں سر کشیدہ صنوبر کو دیکھ کر
کب دل کو خواہشِ قد و قامت نہیں رہی

دل میں شکایتیں بھی رہیں رنجشوں کے ساتھ
لیکن کبھی کسی سے کدورت نہیں رہی

بھولے سے بھی کسی کا اگر دل دکھا دیا
ایسا نہیں ہوا کہ ندامت نہیں رہی

آنے لگا ہے کیوں یہ مجھے موت کا خیال کیا
اب کسی کو میری ضرورت نہیں رہی

جب چشمِ شوق جاتی تھی پردوں کے پار بھی
وہ شوخیٔ نظر، وہ بصارت نہیں رہی

جو کفر سے بنی تھی وہ قائم ہے آج بھی
جو ظلم سے چلی وہ حکومت نہیں رہی

سن لینا ایک روز کہ اِن ظالموں کے ہاتھ
یوں شَل ہوئے کہ ظلم کی طاقت نہیں رہی

○

جینا خوشی کے ساتھ نہ مرنا خوشی کے ساتھ
کیسا عجب مذاق ہے یہ آدمی کے ساتھ

دنیا کا کیا سلوک بتائیں علیؑ کے ساتھ
اک بغض تیرگی کو رہا روشنی کے ساتھ

وہ ربط ہے کسی کا مری زندگی کے ساتھ
جو قافیے کو ہوتا ہے حرفِ رَوی کے ساتھ

ہو جس میں دل دُکھانے کا پہلو ہنسی کے ساتھ
اچھا نہیں مذاق بھی ایسا کسی کے ساتھ

گزرے ہوئے وصال کے دن یاد آگئے
دیکھا تھا آج ہم نے کسی کو کسی کے ساتھ

تجدیدِ راہ و رسمِ رفاقت کے بعد تو
گزرے ہیں لوگ اور بھی بیگانگی کے ساتھ

غم کے بنا خوشی کا تصوّر محال تھا
رکھا گیا ہے اِس لیے غم بھی خوشی کے ساتھ

دشمن کی بھی شکست پہ ہم خوش نہیں ہوئے
جیتا ہے ہر محاذ کو شائستگی کے ساتھ

کھوئیں گے ایک روز تشخص بھی اپنا ہم
کرتے رہے نباہ جو یوں ہر کسی کے ساتھ

بغض و عناد و کینہ و مکر و ریا ، حسد
کیا کچھ روا نہیں رہا یاں زندگی کے ساتھ

شاعر بنو تو پاس بھی کہنے کو کچھ تو ہو
شعر و سخن ہے فکر کی آسودگی کے ساتھ

(۶۲ ویں سالگرہ کے موقع پر)

○

جو اہلِ دل ہیں آلِ پیمبرؐ کے ساتھ ساتھ
محشر میں ہونگے ساقیٔ کوثرؑ کے ساتھ ساتھ

کمتر کا بھی مقام ہے برتر کے ساتھ ساتھ
کانٹے لگے ہوئے ہیں گُلِ تر کے ساتھ ساتھ

آئی نہ جانے کیوں کسی بچھڑے ہوئے کی یاد
دیکھے جو دو پرند برابر کے ساتھ ساتھ

میرا وجود بھی تو بنے اک چراغِ نور
گردش میں میں بھی ہوں مہ و اختر کے ساتھ ساتھ

دولت تو دی خدا نے مگر دل نہیں دیا
یہ مفلسی رہے گی تونگر کے ساتھ ساتھ

پہلا سا اُن سے ربط و تعلق ہے اب کہاں
وہ بھی بدل گئے ہیں مقدر کے ساتھ ساتھ

ہے روح کی غذا بھی ضروری بدن پرست
اندر کا بھی خیال ہو باہر کے ساتھ ساتھ

اب بھی ہے گرم معرکہ کربلا یہاں
لوگ اب بھی ہیں یزید کے لشکر کے ساتھ ساتھ

کیا جانے کیا دکھائے گا یہ ہجرتوں کا روگ
دنیا بدل گئی ہے مرے گھر کے ساتھ ساتھ

بزمِ سخن بہ پاسِ روایات محترم
باقرؔ ہیں آج حضرتِ اخترؔ کے ساتھ ساتھ

○

غم ہی نہیں ملے کہ مسرت نہیں ملی
ہم کو جہاں کی کونسی دولت نہیں ملی

جس کو کسی حَسیں کی رفاقت نہیں ملی
اُس بد نصیب کو کوئی نعمت نہیں ملی

لاتے کہاں سے وقت عداوت کے واسطے
ہم کو محبتوں ہی سے فرصت نہیں ملی

ہوجائے کاش اُن کا بھی اعمال میں شمار
جن نیکیوں کی ہم کو سعادت نہیں ملی

جن کی طلب تھی اُن سے رہیں دوریاں بہت
وہ مل گئے ہیں جن سے طبیعت نہیں ملی

بازار میں تو اور ہی لوگوں کی مانگ تھی
بکنے گئے تھے ہم بھی پہ قیمت نہیں ملی

ہوتا ہے اُس کو دیکھ کے اکثر یہی گماں
صورت جسے ملی اُسے سیرت نہیں ملی

بھائی کا خون بھائی پہ جس میں حلال ہو
ہم کو تو ایسی کوئی شریعت نہیں ملی

شاہد ہمارے قتل کا سارا ہی شہر تھا
قاتل تو مل گئے تھے شہادت نہیں ملی

اُس بزم میں غزل کبھی باقرؔ نہیں پڑھی
باذوق جس میں ہم کو سماعت نہیں ملی

○

قلم کا قرض چکائیں لکھیں سخن کچھ اور
کہ چاہتے ہیں ابھی ہم سے فکر و فن کچھ اور

چھپا رہا ہے اُدھر تن وہ خوشبدن کچھ اور
دکھا رہا ہے اِدھر تنگِ پیرہن کچھ اور

جو یوں ہی رکھیں گے اہلِ وطن چلن کچھ اور
تو ہو ہی جائے گا یہ رنگِ انجمن کچھ اور

خزاں نصیب بہت منتظر بہار کے تھے
بہار آئی تو لُوٹا گیا چمن کچھ اور

پیمبروں کی ضرورت نہ اب خداؤں کی
جو ہو سکے تو کچھ انسان بن ، نہ بن کچھ اور

کچھ ایسا وقت نے عادی کیا مشقت کا
کہ کام کم ہو تو بڑھ جاتی ہے تھکن کچھ اور

تعلقات کی صورت بدل نہ جائے کہیں
سنی گئی ہیں حکایاتِ مرد و زن کچھ اور

براہمن بھی اُسی ذات کا پجاری ہے
مرے خدا کی ثنا ہے نہیں بھجن کچھ اور

گناہ گار ہیں کس کس کے حضرتِ باقرؔ
نہیں ہے پاس بجز عذر داشتن کچھ اور

○

عجیب شہر کے منظر دکھائی دیتے ہیں
سبھی کے ہاتھ میں پتھر دکھائی دیتے ہیں

خدا ہی جانے کہ اب رہروؤں کا کیا ہوگا
جو راہزن ہیں وہ رہبر دکھائی دیتے ہیں

کہیں وجود عدم ہے کہیں عدم ہے وجود
سب اُس کی ذات کے مظہر دکھائی دیتے ہیں

وفورِ جہل سے پہلے ، شعورِ ذات کے بعد
سب اپنے آپ سے برتر دکھائی دیتے ہیں

عجیب ہے کہ گناہ و ثواب اوروں کے
مجھے تو اپنے ہی اندر دکھائی دیتے ہیں

خرد کی آنکھ سے جذبوں کو دیکھنے والو
یہ دل کی آنکھ سے بہتر دکھائی دیتے ہیں

ذرا قریب سے دیکھو تو وہ بھی راکھ کا ڈھیر
جو دُور سے مہ و اختر دکھائی دیتے ہیں

نہ جانے دیکھے ہوئے کب کے آئینہ سے بدن
نظر پہ نقش ہیں اکثر دکھائی دیتے ہیں

عقیدتوں کی بصارت بھی خوب ہوتی ہے
گناہ گار پیمبر دکھائی دیتے ہیں

ہمیشہ جن کا رہا کرتا تھا فلک پہ دماغ
سنا ہے اب وہ زمیں پر دکھائی دیتے ہیں

ترا وصال ابھی منزلِ خیال میں ہے
مگر وصال کے منظر دکھائی دیتے ہیں

ابھی تو مہرِ سحر برجِ انتظار میں ہے
ابھی تو شام کے منظر دکھائی دیتے ہیں

عطا ہوئی ہے ہمیں دولتِ سخن اتنی
کہ مفلسی میں تونگر دکھائی دیتے ہیں

دیارِ غیر میں چمکا نصیب اردو کا
قدم قدم پہ سخنور دکھائی دیتے ہیں

○

جب نگاہوں میں بات ہوتی ہے
اِک نئی واردات ہوتی ہے

اب بسر یوں حیات ہوتی ہے
دن گزرتا ہے رات ہوتی ہے

صبح ہوتی ہے اُس کی باتوں میں
اُس کی باتوں میں رات ہوتی ہے

زندگی کی دعا سے کیا حاصل
زندگی بے ثبات ہوتی ہے

دن نکلتا ہے اُس کے مکھڑے سے
اُس کی زلفوں سے رات ہوتی ہے

پاس ہوتا ہے رات دن جب وہ
بس وہ دن بس وہ رات ہوتی ہے

تجھ سے بچھڑے تو یہ ہوا معلوم
ہجر کی کیا حیات ہوتی ہے

سائیں سائیں ہے خلوتِ جاں میں
جیسے جنگل میں رات ہوتی ہے

دن گزرتا ہے کس قیامت کا
کس اذیّت کی رات ہوتی ہے

دجلۂ خوں میں ڈوب کر دیکھو
تشنگی بھی فرات ہوتی ہے

جس کے قرضے ادا نہیں ہوتے
نظرِ التفات ہوتی ہے

مرنے والے ہیں ایسے بھی جن کی
موت رشکِ حیات ہوتی ہے

○

حُسن پر حُسن نظر رکھتے ہیں
ہم بھی جینے کا ہنر رکھتے ہیں

خیر کے ظرف میں شَر رکھتے ہیں
چیز اِدھر کی جو اُدھر رکھتے ہیں

ہر کوئی تو نہیں رکھتا وہ نظر
جو نظر اہلِ نظر رکھتے ہیں

راہِ تحقیق میں دُھن کے پکے
شہرِ ایجاد میں گھر رکھتے ہیں

روشنی کا وہی کرتے ہیں سفر
ظلمتوں پر جو نظر رکھتے ہیں

یہ جبیں ہر جگہ جھکتی تو نہیں
سنگ کو دیکھ کے دَر رکھتے ہیں

جو نہیں چلتے مری راہوں پر
وہ بھی اک راہ گزر رکھتے ہیں

ہر مسبب کو سبب ہے درکار
وہ ہی اُڑتے ہیں جو پر رکھتے ہیں

اُن کو تاریخ نہیں بھولتی جو
دامنِ شب میں سحر رکھتے ہیں

○

دانا ہیں حسینوں سے جو اَن بَن نہیں رکھتے
پَر خاش بُتوں سے تو برہمن نہیں رکھتے

دِل پر تو یہ لازم ہے کہ آئے وہ کسی پر
وہ دل نہیں ہوتے ہیں جو بندھن نہیں رکھتے

ملنا ہمیں ہوتا ہے تو ہم ملتے ہیں کُھل کر
دیوار میں در رکھتے ہیں روزن نہیں رکھتے

آتا نہیں اُن لوگوں کو جینے کا سلیقہ
جو دھار پہ تلوار کی گردن نہیں رکھتے

طائر بھی زمانے کی ہوا دیکھ رہے ہیں
ہر شاخ پہ بنیادِ نشیمن نہیں رکھتے

اُن کے لیے ہوتے ہیں محبت کے اجالے
نفرت کے چراغوں کو جو روشن نہیں رکھتے

کیا حبس ہے ، جھونکا بھی نہیں تازہ ہوا کا
یہ گھر بھی عجب ہیں کہ جو آنگن نہیں رکھتے

بھیگی ہوئی آنکھوں پہ کسی کی کبھی رکھ دیں
اتنی بھی وہ گنجائشِ دامن نہیں رکھتے

وہ دشمنِ جاں ہے تو چلو دشمنِ جاں کو
سینے سے لگا لیتے ہیں دشمن نہیں رکھتے

گرمی سے پگھل جاتے ہیں وہ موم کی صورت
کردار میں جو سختیِ آہن نہیں رکھتے

اِس طرح کے انسان اگر ہیں، تو کہاں ہیں
باہوش ہیں لیکن کوئی الجھن نہیں رکھتے

اِس عہد کے اربابِ لُغت اب یہ لکھیں گے
فنکار اُنھیں کہتے ہیں جو فن نہیں رکھتے

ہے خاطرِ احباب میں اُن سے بھی شکایت
وہ لوگ جو مامون کو 'ایمن' نہیں رکھتے

○

کچھ نئے حرف لکھوں ، کوئی نئی بات کروں
کچھ تو ہو پاس مرے جس سے مباہات کروں

اجنبیّت ترے ماحول میں دم گھٹتا ہے
کوئی ایسا بھی ملے جس سے کوئی بات کروں

کچھ تو مجھ سے بھی ملے میرے تمدّن کا سُراغ
تَرک میں کیوں روشِ پاسِ روایات کروں

گردشِ وقت کہ پوچھے ہے زمانے کا مزاج
سامنے آئے ذرا ، میں بھی تو دو ہات کروں

نہ کسی زلف کا سایا نہ کسی جسم کی دھوپ
زندگی کس کے سہارے بسر اوقات کروں

چھین لیتا ہے مسیحا سے شفا کی طاقت
کیا دعاؤں سے ملے گا کہ مناجات کروں

بازوؤں میں نہیں طاقت کہ اُٹھاؤں کوئی بوجھ
اور یہ عزم کہ تبدیلی حالات کروں

جھانک کر اپنے گریباں میں تو دیکھوں نہ کبھی
ساری دنیا سے زمانے کی شکایات کروں

آپ ہی آپ بدلتے ہیں یہ منظر سارے
رات کو دن کروں نہ دن کو کبھی رات کروں

ایک دل کم ہے محبت کی تواضع کے لیے
کس طرح اتنے حسِینوں کی مدارات کروں

دم ہے ہونٹوں پہ تو سب آئے ہیں ملنے کے لیے
آخری وقت ہے کس کس سے ملاقات کروں

اُس سے اِک بات بھی کہتے نہیں بنتی باقؔر
جس سے چاہے ہے بہت جی کہ ہر اِک بات کروں

○

نہ ڈگمگا کے چلے اور نہ لڑکھڑا کے چلے
دَیارِ حُسن میں دُھومیں مچا مچا کے چلے

زمانے بعد ملے اور جھلک دِکھا کے چلے
ابھی تو آئے ہو بیٹھو یہ کیا کہ آ کے چلے

اُسی کو آتا ہے چلنا دیارِ ہستی میں
جگہ دلوں میں جو اپنی بنا بنا کے چلے

محبتوں کے سفر میں ہمیں رہے آگے
بتوں کی راہ میں ہم دو قدم بڑھا کے چلے

ذرا سی دیر میں سارا طلسم ٹوٹ گیا
نکل کے سانپ پیمبر کے جب عصا کے چلے

زمانے بھر میں یہی ناقدوں کی چال رہی
اِسے بڑھا کے چلے اور اُسے گھٹا کے چلے

یہ ہجرتوں کا ستم دیکھیے کہاں پہنچے
مدینہ و نجف و ارضِ کربلا کے چلے

جہاں جہاں رَوِشِ حُبِ ذات تھی حائل
وہاں چلے تو فقط مسئلے اَنا کے چلے

حصارِ ذات سے باہر جو لوگ آ نہ سکے
وہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا کے چلے

کبھی کسی نے ہمیں بھی سکھایا تھا چلنا
ہمارے بچّے بھی ہم کو چلا چلا کے چلے

تمام عمر رہے ہم انیؔس کے پیرو
"چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے"

کتابِ وقت پہ ٹھہرے تو ہے سخن باقرؔ
وگرنہ شور بہت یوں تو واہ وا کے چلے

مصرعِ طرح "چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے"
دوسو سالہ تقریبات میر انیسؔ پر غالبؔ اکیڈمی ٹورانٹو کینیڈا کے طرحی مشاعرے میں پڑھی گئی

○

کب اُس سے بڑھ کے کوئی فصاحت شعار ہے
جو لفظ جس جگہ ہے دُرِ شاہوار ہے

مونس ہے کوئی اور نہ کوئی غم گُسار ہے
یہ بھی بڑی عنایتِ پرور دگار ہے

"جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے"
اردو زباں کا آج بھی اِک شاہکار ہے

تشبیہہ و استعارہ و تلمیحِ لا جواب
اُس کے مبالغے پہ صداقت نثار ہے

جس کے ہر اِک زمیں پہ ہیں جھنڈے گڑے ہوئے
میدانِ شاعری کا یہ وہ شہسوار ہے

باغِ سخن سے اُس کے خزاں کا گزر نہیں
یہ وہ چمن ہے جس پہ ہمیشہ بہار ہے

ممکن کہاں ہے ایسا بلاغت نشاں کوئی
حرفِ ثقیل اُس کی طبیعت پہ بار ہے

قِرطاسِ مرثیہ پہ کیے معجزے رقم
معجز نما قلم ہے، جواہر نگار ہے

جو لکھ دیا قلم نے، وہی مستند ہوا
جو کم نہ ہوسکے گا یہ وہ اعتبار ہے

جس کو سخنوروں نے خدائے سخن کہا
وہ بندگانِ شعر کا پروردگار ہے

کچھ اُس کی غربتوں کا بھی اندازہ کیجیے
اپنے وطن میں بھی جو غریب الدّیار ہے

دنیا ہے ظلم و جور کے رستہ پہ گامزن
مطلوبِ عصر آ کہ ترا انتظار ہے

مصرعِ طرح ''پیری کے ولولے ہیں خزاں کی بہار ہے''
(دوصد سالہ جشنِ انیس زیرِ اہتمام ادارۂ فیضِ ادب بمقام ادارۂ جعفریہ میری لینڈ میں پڑھی گئی)

○

یہ آشنا کا ہے نہ کسی اجنبی کا ہے
جو دل میں گھر بناتا ہے، دل تو اُسی کا ہے

میرے ہنر کا ہے، نہ مری شاعری کا ہے
غزلوں سے میری شہر میں چرچا اُسی کا ہے

بدلے حَسیں تو عشق کی دنیا بدل گئی
جو دل کسی کا ہوتا تھا اب ہر کسی کا ہے

کیوں ڈھونڈتے ہیں لوگ کسی اور راہ کو
سیدھا تو ایک راستہ بس راستی کا ہے

اِس نے تو اور کھول دیے راستے کئی
اِک شور ہر طرف جو یہ دہشت گری کا ہے

پڑتا ہے مہر و مہ کا اندھیروں سے واسطہ
ظلمت کے راستوں میں سفر روشنی کا ہے

جن کا رہا ہمیشہ اِجارہ بہار پر
اب وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ گلشن سبھی کا ہے

دِل کے معاملات میں دنیا کا دخل کیا
کچھ جبر کا نہیں ہے یہ سودا خوشی کا ہے

اِس عرصۂ حیات میں نعمت ہے موت بھی
جو موت کا خدا ہے وہی زندگی کا ہے

پنہاں نہیں رہا ہے بصیرت کی چشم سے
جو قحط سیلِ نور میں اب روشنی کا ہے

لگتا ہے اعتبار کی دولت ملی مجھے
اہلِ نظر میں ذکر مری شاعری کا ہے

نسبت کمال سے ہے ہر اہلِ کمال کو
غالبؔ کو دیکھ لیجیے، بندہ علیؑ کا ہے

○

اللہ اللہ چاہتیں اُس کی
چاہتوں میں عنایتیں اُس کی

کون کرتا شکایتیں اُس کی
فرد اُس کے جماعتیں اُس کی

لوگ سنتے ہیں اُس کی باتوں کو
کیا بھلی ہیں حکایتیں اُس کی

قریۂ دل سے قریۂ جاں تک
شہر اُس کے ریاستیں اُس کی

مستقل ہیں ادب کا سرمایہ
شاعری میں روایتیں اُس کی

حفظ ہو جیسے کُل کلامِ انیس
وہ بیاں میں فصاحتیں اُس کی

ایسا انشا کہ کیا لکھیں انشا
گفتگو میں سلاستیں اُس کی

داستانوں کی داستانیں ہیں
گوشِ جاں ہیں سماعتیں اُس کی

وضع کا پاس رکھ رکھاؤ کے ساتھ
جدّتوں میں قدامتیں اُس کی

موزوں مصرعے کی طرح بحر میں جسم
سب غزل کی لطافتیں اُس کی

زلف و بازو ، قد و رخ و رخسار
قامتوں میں قیامتیں اُس کی

آخرِ شب میں صبحِ نو کی نوید
وہ بدن اور صباحتیں اُس کی

غنچہ و گُل تو استعارے ہیں
کوئی دیکھے نزاکتیں اُس کی

وقت اُس کا ہے، ماہ و سال اُس کے
جس نے پائی ہیں ساعتیں اُس کی

جیتے جی جیسے مل گئی ہو بہشت
قُرب اُس کا ، قرابتیں اُس کی

کوئی ایسا کہیں ملا ہی نہیں
ڈھونڈتے ہیں شباہتیں اُس کی

میرؔ کی طرح سب اسیر ہوئے
سب نے کی ہیں وکالتیں اُس کی

شیخ و زاہد ہیں اُس کے حلقہ بگوش
دیکھ لی ہیں کرامتیں اُس کی

سب ہی ممنون اُس کے لُطف کے ہیں
وہ نوازش کی عادتیں اُس کی

وعدۂ چشمِ التفات لیے
منتظر ہیں بشارتیں اُس کی

کام جیسے کوئی رہا ہی نہیں
وِرد اُس کا ، عبادتیں اُس کی

بُت پرستی سی بُت پرستی ہے
سجدے اُس کے ، اقامتیں اُس کی

یہ قصیدہ ہو یا غزل باقرؔ
رنگ لائیں رفاقتیں اُس کی

○

جو محبت سے بلاتا ہے چلا آتا ہوں میں
سہل جس کا جوڑنا ہے بس وہی ناتا ہوں میں

کوئی شکوہ اپنے ہونٹوں پر کہاں لاتا ہوں میں
اپنے من کی آگ میں چپ چاپ جل جاتا ہوں میں

جو مرا رب ہے وہی ہے ربِ حُسنِ کائنات
کب حصارِ حُسن سے باہر کہیں جاتا ہوں میں

حُسن جیسا ہو جہاں ہو کھینچ لیتا ہے مجھے
بے ارادہ بے سبب کھنچتا چلا جاتا ہوں میں

یہ مرا میرے قلم سے ایک سمجھوتا سا ہے
یہ جو لکھواتا ہے مجھ سے بس لکھے جاتا ہوں میں

راستوں کی بھیڑ بھی منزل سے کر دیتی ہے دور
کیسے انجانے سے رستوں پر نکل جاتا ہوں میں

جب بلائے گا خدا تو اُس کے گھر بھی جاؤنگا
بن بلائے تو کسی کے گھر نہیں جاتا ہوں میں

یہ نہیں ہے گر تو آخر اور ناسمجھی ہے کیا
جو سمجھ سکتے نہیں ہیں اُن کو سمجھاتا ہوں میں

جہل جیسا ہو ، برا ہے جہلِ مذہب الاماں
خود کُشی کرتا ہے کوئی اور مر جاتا ہوں میں

بحرِ غم میں ناؤ کی صورت ہے میری زندگی
وقت کی موجیں رواں ہیں اور بہے جاتا ہوں میں

اجنبی ماحول ہی مجھ کو برا لگتا نہیں
بارہا اپنوں کی محفل میں بھی گھبراتا ہوں میں

محرمانِ شہرِ دل ، سود و زیاں کا کیا حساب
جانے کیا کچھ کھو چکا ہوں جانے کیا پاتا ہوں میں

میرؔ کی غزلیں تو مجھ کو اور کرتی ہیں اُداس
داغؔ کی غزلوں سے اپنے جی کو بہلاتا ہوں میں

لوگ پچھتاتے نہیں کرکے بدی اتنے یہاں
نیکیاں کر کر کے باقرؔ جتنا پچھتاتا ہوں میں

○

کسی فضا، کسی تہذیبِ بام و در میں رہے
مگر یہ حُسن کا حق ہے کہ ہر نظر میں رہے

وطن کے کوچۂ و بازار یوں نظر میں رہے
کہ ہم تو گھر سے نکل کر بھی جیسے گھر میں رہے

جو شہرِ جاں میں، حَسینوں کی رہ گزر میں رہے
وہ شب گزیدہ نہ تھے دامنِ سحر میں رہے

بجھا سکیں نہ زمانے کی آندھیاں بھی اُنھیں
جو شمع بن کے محبت کی رہ گزر میں رہے

رہِ حیات میں تقلید کا شِعار رکھا
سو ہم کسی نہ کسی مکتبِ نظر میں رہے

کبھی سفر میں کبھی منزلوں پہ یاد آئے
تھکے ہوئے مرے ساتھی جو رہگزر میں رہے

عجب ہے راہِ محبت کہ ختم ہوتی نہیں
تمام عمر کوئی کس طرح سفر میں رہے

چراغ بانٹنے والوں کی مصلحت ٹھہری
کسی کے گھر کا اندھیرا کسی کے گھر میں رہے

سجا ہوا ہے بدن پر لباسِ بے ہنری
یہ زَعم بھی ہے کہ ہم حلقۂ ہنر میں رہے

اِسی چلن سے چلی ہے روش بزرگوں کی
شگونِ بد تو نہیں گر پِدَر پِسر میں رہے

نئے نئے ہیں ابھی میل جول کے بندھن
کبھی کُھلے گا کہ ہم چشمِ کم نظر میں رہے

کچھ اِس طرح بنی آپس کے اعتماد کی شکل
کہ احتمال تھا غالب ، اگر مگر میں رہے

دیارِ دل میں تن آساں نہیں رہے باقرؔ
قبول خوب کیا ، فکرِ خوب تر میں رہے

○

جو کہتے ہیں کہ ہم انسانیت سے پیار کرتے ہیں
وہی تو امن کے رستوں کو ناہموار کرتے ہیں

مسیحائی کی شہرت جن کی ہے سارے زمانے میں
جو صحت مند مل جائے اُسے بیمار کرتے ہیں

مکیں جب چھوڑتے ہیں گھر تو یہ محسوس ہوتا ہے
نظر حسرت کی اُن پر بھی در و دیوار کرتے ہیں

یہ مَندِر ہے کہ بت خانہ، کلیسا ہے کہ ہے مسجد
عمارت کا تعیّن گنبد و مینار کرتے ہیں

کسی کچّے گھڑے پر اب کوئی ہمت نہیں کرتا
بہت سے لوگ روزانہ ہی دریا پار کرتے ہیں

محبت میں بھی اُن کا ہر گھڑی موقف بدلتا ہے
کبھی اِقرار کرتے ہیں، کبھی اِنکار کرتے ہیں

مرے پُرکھوں سے جاری رسم ہے میرے قبیلے میں
کہ مانجھی ڈوب کر طوفاں سے بیڑا پار کرتے ہیں

کہاں کی خیر خواہی ، دوستی ، اخلاص و ہمدردی
نہ اب وہ یار کرتے ہیں نہ یارِ غار کرتے ہیں

گلا بھائی کا اپنے کاٹ دیں جنّت کے لالچ میں
مسلمانوں ہی سے ممکن ہے کب کفّار کرتے ہیں

چھپے چوری جو خلوت میں بھی مشکل ہی سے ہوتا تھا
یہاں کے منچلے بچّے سرِ بازار کرتے ہیں

وہ کہتے ہیں اُنھیں کیا اور کچھ کرنا نہیں آتا
جو میٹھی نیند سے پچھلے پہر بیدار کرتے ہیں

کوئی ہنستا ہے میرے شعر سن کر ، کوئی جلتا ہے
چلو کچھ کام تو محفل میں یہ اشعار کرتے ہیں

جنونِ عشق ہے ، کارِ خرد منداں نہیں باقرؔ
یہ دیوانوں کے ہیں ، کب کام یہ ہشیار کرتے ہیں

○

بے آس کوئی ہو تو کرم کیا نہیں رکھتے
وہ ہم ہیں کہ قاتل کو بھی پیاسا نہیں رکھتے

بد بینوں کی نظروں میں تو اچھا نہیں رکھتے
اشعار مرے مجھ کو کہیں کا نہیں رکھتے

یہ بات ضروری ہے کہ محبوب نیا ہو
ہم دل میں کسی اور کو رکھا نہیں رکھتے

قسمت میں اُنھیں کے ہے زمانے میں بلندی
موقوف کوئی کام جو اپنا نہیں رکھتے

یہ لازم و ملزوم ہیں مشکل ہے یہ کہنا
سر رکھتے ہیں لیکن کوئی سودا نہیں رکھتے

نیکی و بدی ، عیب و ہنر ایک نہیں ہیں
اچھوں کو بروں کو کبھی یکجا نہیں رکھتے

ہم جیسے نہ دنیا میں کہیں ہیں نہ ملیں گے
پیاسے ہیں مگر خواہشِ دریا نہیں رکھتے

کچھ اِس لیے چہروں پہ سجائی ہیں نقابیں
دنیا کو دکھا سکتے ، وہ چہرہ نہیں رکھتے

یہ خودکُش و خودسوز ہیں دنیا سے نرالے
مرجاتے ہیں جینے کا سلیقہ نہیں رکھتے

بٹ جاتے ہیں فرقوں میں، گروہوں میں قبیلے
ہم لوگ کہیں خود کو اکٹھا نہیں رکھتے

راہوں کے دیے بھی تو اُنھیں رکھنے ہیں روشن
جو لوگ کبھی گھر میں اندھیرا نہیں رکھتے

جو اہلِ سخن ہیں وہ جواں رہتے ہیں باقرؔ
شاعر تو دلوں کو کبھی بوڑھا نہیں رکھتے

○

حُسن سے رسم و راہ ڈھونڈتے ہیں
لوگ جائے پناہ ڈھونڈتے ہیں

قتل وغارت بھی بن گیا ہے نصاب
لوگ اب درسگاہ ڈھونڈتے ہیں

خود کُشی راس آگئی ہے بہت
روز اِک قتل گاہ ڈھونڈتے ہیں

منزلیں اِس طرح نہیں ملتیں
جو بھٹکتے ہیں راہ ڈھونڈتے ہیں

پھر نظر دشمنوں پہ جاتی ہے
پھر کوئی خیرخواہ ڈھونڈتے ہیں

خواہشِ حُسن ہے ہمیں بھی مگر
ہم کوئی کجکلاہ ڈھونڈتے ہیں

آ گئی ہے سپیدی بالوں میں
چشم و ابرو سیاہ ڈھونڈتے ہیں

لوگ اللہ تک نہیں جاتے
مسلکِ لا اِلٰہ ڈھونڈتے ہیں

تم بھی دنیا کو دو طلاقیں تین
ہم بھی اِک خانقاہ ڈھونڈتے ہیں

○

ہر گھڑی منظر سُہانا چاہیے
حُسن کو ہر رنگ دیکھا چاہیے

حُسن سے سیری تو ہوتی ہی نہیں
اور اچھا اور اچھا چاہیے

اب قناعت کا قرینہ اور ہے
اب تو ہر پیاسے کو دریا چاہیے

ظلم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دے
کوئی ایسا بھی تو ہونا چاہیے

آنے والے ہی سدا جاتے ہیں کیوں
جانے والوں کو بھی آنا چاہیے

اب کہاں وہ عشق میں درماندگی
کون ہے اب جس کو صحرا چاہیے

جلوہ گر ہو پیکرِ رعنا تو پھر
دیکھتی آنکھوں کو دیکھا چاہیے

سب حَسیں سب کے نہیں ہوتے مگر
کوئی اپنا بھی تو ہونا چاہیے

ظلم بھی دنیا سے اب ناپید ہو
جو نہیں ہوتا ہے ہونا چاہیے

وہ زمانہ جس کو اپنا کہہ سکیں
اُس زمانے کو زمانہ چاہیے

زندگی عزّت کی اور عزّت کی موت
کیا بتائیں ہم کو کیا کیا چاہیے

آپ باقؔر کیوں نہیں بدلے ابھی
آپ کو بھی اب بدلنا چاہیے

(مامون ایمنؔ کی زمین میں)

○

تم ہوئے جب سے مہربان میاں
منحرف ہوگیا جہان میاں

جس کو دیکھو وہ دیکھتا ہے تمہیں
کیا نکالی ہے یہ اُٹھان میاں

تم کو مالک بری نظر سے بچائے
خیر سے تم ہوئے جوان میاں

کبھی اِس کا بھی کچھ بھرم رکھو
ہم کو تم پر بڑا ہے مان میاں

سنتا سب کی ہے کرتا اپنی ہے
ہے بڑا مطلق العنان میاں

ہم کسی کے برے بھلے میں نہیں
ہم سے ہوتے ہو بد گمان میاں

ہم تو بس منتظر ہی رہتے ہیں
کبھی آ رہیو میہمان میاں

جاں ہتھیلی پہ رکھّے پھرتے ہو
جان ہے گر تو ہے جہان میاں

اب وہ اگلا سا کیوں تپاک نہیں
آ گیا کون درمیان میاں

صدقہ خیرات ہے ثواب کا کام
دو کبھی حُسن کا بھی دان میاں

کچھ ہمارا خیال بھی رکھنا
ہم تمھارے ہیں قدر دان میاں

سب ضرورت کی جِنس ملتی نہیں
نئی کھولی ہے کیا دُکان میاں

دِل میں رہتے ہیں ہم حَسینوں کے
اِس سے اچھا نہیں مکان میاں

کتنے دھڑکے لگے ہی رہتے ہیں
اب کہاں دل کو اطمینان میاں

پڑھ لو دیوار کا لکھا بھی کبھی
دھرو باتوں پہ کچھ دھیان میاں

کسی کسرت کی کیا ضرورت ہے
عشق کرتا ہے دھان پان میاں

روز مرتے ہیں اور مرتے نہیں
ہم بھی ہیں کتنے سخت جان میاں

ہر طرف ظلم ہے جدھر دیکھو
امن کیسا ، کہاں امان میاں

ایک تہذیب کی علامت ہے
جس کو کہتے ہیں پان دان میاں

شاعری میں یہ دوڑ ٹھیک نہیں
دھیرے دھیرے ، ذرا رسان میاں

اردو اب سب کے گھر کی باندی ہے
یہ کسی کی نہیں زبان میاں

نام کی تختی ، قبر کا کتبہ
اور کیا نام کیا نشان میاں

''کبھی آ رہیو میہمان میاں'' ڈاکٹر سید ناظر حسن زیدی نے اٹلانٹا کی ایک شعری نشست سے رخصت ہوتے وقت یہ جملہ مجھ سے کہا تھا۔ کئی سال بعد جب اُن کی موت کی خبر سنی تو اُن کا یہ فقرہ بے ساختہ یاد آیا۔ اور میں نے اسے مصرع قرار دے کر اُن کی محبتوں اور شفقتوں کا قرض ادا کرنے کی خاطر یہ غزل کہی۔

○

حُسن کا ہر اک جلوہ دیکھا
اِن آنکھوں نے کیا کیا دیکھا

بنتے کھیل بگڑتے دیکھے
بگڑا کام سنورتا دیکھا

اَن ہونی بھی ہوتے دیکھی
ہونی کا نا ہونا دیکھا

مسجد ، مندِر اور کلیسا
انسانوں کو بٹتا دیکھا

گھر کو خود ہی پھونک کے ہم نے
اپنا آپ تماشہ دیکھا

بات کے دو اندازِ نظر تھے
جھوٹا دیکھا ، سچّا دیکھا

چہروں میں آئینے دیکھے
آئینوں میں چہرہ دیکھا

ایسے لمحے بھی گزرے ہیں
جیسے کوئی سپنا دیکھا

اِک سُندر مکھڑے میں ہم نے
کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

حُسنِ نظر ہے میری نظر میں
جو بھی دیکھا اچھا دیکھا

تشنہ لبی سی تشنہ لبی ہے
دریاؤں کو پیاسا دیکھا

کاش کبھی تو ٹھہرا ملتا
وقت کو ہر دم جاتا دیکھا

اُس کو آنا بھی تو نہیں تھا
جِس کا ہم نے رستہ دیکھا

اپنی ذات میں جو محفل تھا
اُس کو آج اکیلا دیکھا

حدِ نظر سے اور آگے بھی
اِن آنکھوں نے کیا کیا دیکھا

○

کسی کی پشت پہ ہم چُھپ کے وار کیا کرتے
جو راہ اپنی نہ تھی اِختیار کیا کرتے

جو تھی ہماری طلب ، بن گئی سبھی کا ہدف
تمام شہر تھا امیدوار، کیا کرتے

طلب کے بعد تو شرمندگی طلب کی رہی
دراز دستِ طلب بار بار کیا کرتے

تمام عمر چمن میں رہے خزاں دیدہ
امیدِ آمدِ فصلِ بہار کیا کرتے

خرامِ عصر میں دنیا کا جو چلن تھا، چلے
خلافِ مصلحتِ روزگار کیا کرتے

کسی نگاہ کو خالی کبھی نہ لوٹایا
محبتوں کو ہم اپنی شمار کیا کرتے

ہمارے قتل پہ راضی تھے سارے شہر کے لوگ
بھرا ہوا تھا دلوں میں غبار کیا کرتے

جنھیں یقیں تھا، نہیں عشق اُس کنارے بھی
وہ کشتیوں سے بھی دریا کو پار کیا کرتے

کوئی حَسیں نظر آیا، تپاکِ جاں سے ملے
نہیں تھا دِل پہ ہمیں اختیار کیا کرتے

کبھی ہوئے نہیں مایوس تیری رحمت سے
گناہ گار تھے پروردگار کیا کرتے

ہر ایک شخص تھا جس شہر میں وصال طلب
ہم اپنا درد وہاں آشکار کیا کرتے

قرار و قول میں جس کی نہیں نہیں نہ ہوئی
ہم اُس کی ہاں کا بھلا اعتبار کیا کرتے

ڈرا رکھا تھا جہنّم سے جن کو مُلّا نے
وہ وقتِ وصل بھی بوس و کنار کیا کرتے

○

جلوہ گر طینتِ فاضل میں اثر کس کا ہے
علم کے شہر میں کُھلتا تھا جو در کس کا ہے

جس کے پرتَو سے ہوئی راہِ محبت روشن
چاند چہرہ وہ سرِ راہ گزر کس کا ہے

جس نے ہر آنکھ کو مصروفِ نظارہ رکھّا
شہرِ بینا میں وہ فیضانِ نظر کس کا ہے

بے حقیقت تھے جہاں عصر و زماں کون و مکاں
اُس بلندی سے بلندی کا سفر کس کا ہے

دن رہے ڈوب گیا ہو کوئی سورج جیسے
قریۂ جاں سے مرے عزمِ سفر کس کا ہے

تھک کے دورانِ سفر چھاؤں میں بیٹھی دنیا
یہ کسی نے بھی نہ جانا کہ شجر کس کا ہے

خوف سے عمر تو ساری کٹی محرومیوں میں
پھر گناہوں کا پلندہ مرے سر کس کا ہے

آج پہچاننے میں تم کو تکلّف ہے بہت
کل جہاں شام گزاری تھی وہ گھر کس کا ہے

یوں تو گزرے ہیں بہت اہلِ سخن، اہلِ کمال
نقص جس میں نہیں ممکن وہ ہنر کس کا ہے

حشر میں بھی مجھے مشکل کوئی ہوگی کیسے
نام ہونٹوں پہ مرے شام و سحر کس کا ہے

○

دِل، دِل سے ملانے میں مزہ آتا ہے
کچھ کر کے دکھانے میں مزہ آتا ہے

ظالم کو گِرانے میں مزہ آتا ہے
گرتوں کو اُٹھانے میں مزہ آتا ہے

جس راہ پہ دشوار بہت ہو چلنا
اُس راہ پہ جانے میں مزہ آتا ہے

اچھا نہیں لگتا کوئی روتا ہوا طفل
بچّوں کو ہنسانے میں مزہ آتا ہے

گو آگ لگانا نہیں اچھّا لیکن
حاسد کو جلانے میں مزہ آتا ہے

حاصل نہیں ہوتا کبھی آسانی سے
حق پھر بھی جتانے میں مزہ آتا ہے

یا جدّتِ الفاظ ہو یا فکر نئی
کچھ ڈھونڈ کے لانے میں مزہ آتا ہے

آتے ہیں تصوّر میں جو چہرے، اُن کی
تصویر بنانے میں مزہ آتا ہے

باطل جو مقابل ہو تو حق کی خاطر
گھر بار لُٹانے میں مزہ آتا ہے

بے سعیِ طلب ہوں تو خزانے بے کار
کچھ کھوئیں تو پانے میں مزہ آتا ہے

ہو بے بس و مجبور جو بے کس اُس کو
آنکھوں پہ بٹھانے میں مزہ آتا ہے

اِک آگ بھی ایسی ہے لگا کر جس کو
پھر آپ بجھانے میں مزہ آتا ہے

جس بزم کی ہوتی ہے سماعت اچھی
اشعار سنانے میں مزہ آتا ہے

ہو کتنی ہی راحت کہیں لیکن باقرؔ
اپنے ہی ٹھکانے میں مزہ آتا ہے

○

حُسن جب دل پذیر ہوتا ہے
بھالا ہوتا ہے تیر ہوتا ہے

رند ایسے کبھی ہوئے ہیں کہیں
جیسا حُجرے میں پیر ہوتا ہے

آدمی خود ہے کاتبِ تقدیر
ہاتھ کی خود لکیر ہوتا ہے

جیسا رانجھا ہو جس زمانے میں
ویسا اندازِ ہیر ہوتا ہے

دِل ہمارا جہانِ الفت میں
دوستی کا سفیر ہوتا ہے

اب وہ آشفتہ سر نہیں ہوتے
اب کہاں کوئی میرؔ ہوتا ہے

ہم تو بس ایک بات جانتے ہیں
پہلے مارے، سو میر ہوتا ہے

عورتیں ہی تو بے نظیر نہیں
مرد بھی بے نظیر ہوتا ہے

اُتنا ملتا ہے آج اُس کو عروج
جتنا جو بے ضمیر ہوتا ہے

دیکھتے ہیں وہ گھر میں باقرؔ کے
کب سکونت پذیر ہوتا ہے

○

دائمی اچھی نہیں ہے ، عارضی اچھی نہیں
چار دن کی زندگی میں دشمنی اچھی نہیں

برہمی اچھی ہے گر کوئی تو تیری زلف کی
اے مزاجِ یار تیری برہمی اچھی نہیں

جو نگاہوں کو بصارت دے بصیرت چھین لے
تیرگی بہتر ہے ، ایسی روشنی اچھی نہیں

وقت الفت کے لیے کم ہے، تو کیسی نفرتیں
بے محبت ہو تو عمرِ خضر بھی اچھی نہیں

اُس کے معیارِ ادب پر بھی تو کوئی بات ہو
جو یہ کہتا ہے غزل کی شاعری اچھی نہیں

○

دیارِ درد سے وہ کیوں نہ شاد کام آئے
تمھارے چاہنے والوں میں جس کا نام آئے

خدا کرے کبھی ایسا کوئی مقام آئے
تمھارا ذکر جہاں ہو ہمار ا نام آئے

مرے وطن میں اُسے خوش نصیب کہتے ہیں
جو صبح گھر سے گیا ہو پلٹ کے شام آئے

عجیب رنگ سے پھیلا سیاستوں کا جنوں
جو ہوشیار تھے پہلے وہ زیرِ دام آئے

ہم آئے تھے تو کسی نے نظر نہیں ڈالی
وہ آئے ہیں تو ہر اِک سمت سے سلام آئے

اُلٹ ہی جائے گی اِک دن بساطِ میخانہ
اگر پیاسوں کے ہونٹوں تلک نہ جام آئے

جنھیں پسند نہیں آتا احترامِ رسولؐ
کہاں سے اُن کو بزرگوں کا احترام آئے

ہے ذکر عمر کا کیا یہ تو کٹ ہی جائے گی
وہ زندگی تو ملے جو کسی کے کام آئے

دیارِ عشق میں یہ دھاندلی نہیں ہوتی
کسی نے کام کیا ہو، کسی کا نام آئے

عجیب بات ہے ہم جس مشاعرے میں گئے
ہزار بار کا سُن کر وہی کلام آئے

یہ اور بزم نہیں، بزمِ حُسن ہے باقرؔ
یہاں کے صبح کے بھولے کبھی نہ شام آئے

○

خوش بدن جب کوئی دیکھا ترے پیکر کی طرح
دِل سے نکلا ہی نہیں وصل کے منظر کی طرح

آ کبھی رہنے کو دِل میں بھی مرے گھر کی طرح
قریۂ جاں میں بکھر زلفِ معطّر کی طرح

ہم وہ دریا نہیں جو بحر میں جا گرتے ہیں
اپنے ہی ظرف میں رہتے ہیں سمندر کی طرح

کوئی گرتا ہوا اچھا نہیں لگتا ہم کو
اشک آنکھوں پہ سجا رکھے ہیں گوہر کی طرح

لوحِ محفوظ پہ لکھی ہوئی تحریر ہیں ہم
محو ہو سکتے نہیں حرفِ مکرّر کی طرح

جس کو دیکھو وہ بڑھا جاتا ہے ناحق کی طرف
کوئی تو پلٹے کبھی حر کے مقدّر کی طرح

تنگیِ شرکت احساس کے مارے ہوئے لوگ
گھر میں بستے تو ہیں لیکن کسی بے گھر کی طرح

سجدہ ریزی کو جبینیں بھی ہیں در بھی ہیں مگر
نہ مرے سر کی طرح ہیں نہ ترے در کی طرح

کتنے آئے ہیں نبیؑ کتنے صحیفے اترے
ایک بندہ نہیں سیرت میں پیمبرؐ کی طرح

اب کہاں تیرگیِ شام کے زرداروں میں
ایسا بے زر جو نظر آئے ابوذر کی طرح

جس کے بس میں ہو حسینوں کی لگاوٹ کا طلسم
پھونک دے میرے رگ و پے میں بھی منتر کی طرح

دعویٰ عشقِ علیؑ سب کو بہت ہے لیکن
کوئی آئے تو نظر مالکِ اُشتر کی طرح

شخصیت اور ہی ہوتی مری باقرؔ شاید
لوگ لیتے نہ مرا نام جو باقرؑ کی طرح

○

سڑکوں پہ نظر آتے ہیں چلتے ہوئے گھر بھی
گھر بیٹھے ہی کر لیتے ہیں اب لوگ سفر بھی

آجانا بھی ممکن ہے نہ آسکنا بھی ممکن
دیوار بھی موجود ہے گھر میں مرے در بھی

تم شہرِ محبت☆ میں بھی کُھل کر نہیں ملتے
ماحول کا ہوتا نہیں کچھ تم پہ اثر بھی

ظالم کہیں ، شیطان کہیں ، نیک فرشتہ
اِک عالَمِ اسرار ہے دنیا میں بشر بھی

اِس وقت کے چکر سے کوئی بچ نہیں سکتا
گردش میں مہ و سال کی ہیں شام و سحر بھی

وہ یارِ حَسیں کچھ تو ہے خود آپ قیامت
کچھ حُسن میں شامل ہے مرا حُسنِ نظر بھی

منظور تھا قدرت کو یہی پیار کا رشتہ
سو عالَمِ تخلیق میں مادہ بھی ہے نر بھی

وہ رب مرا چاہے مجھے جس حال میں رکھّے
فاقے بھی گوارا ہیں مجھے ، لقمۂ تر بھی

اب جوشِ جنوں کی وہ روایت نہیں باقی
دِل بھی ہیں، محبت بھی ہے، پتھر بھی ہیں، سر بھی

قدرت کی مشیّت ہے کہ قائم ہے تسلسل
نسلوں کے تواتر میں پدر بھی ہیں پسر بھی

اِک آن میں بستے ہوئے شہروں کا اُجڑنا
کیا مرگِ مفاجات سے ممکن ہے مَفَر بھی

یہ خود کُش و خود سوز بھی بے خوف ہیں کتنے
مر جاتے ہیں، مرجانے سے لگتا نہیں ڈر بھی

کیا قہر ہے با جبّہ و باریش مسلماں
مشکوک نظر آتے ہیں جاتے ہیں جِدھر بھی

اِس عمر میں بڑھ جاتے ہیں قربت کے تقاضے
کچھ ثقلِ سماعت بھی ہے کچھ ضعفِ بصر بھی

اِس عہد میں کیا صحتِ الفاظ کا رونا
اب اہلِ خبر صدر کو پڑھتے ہیں صَدَر بھی

کیا جانیے کس طرح کے انسان ہیں باقرؔ
عزّت کی بھی خواہش ہے نہیں پاس ہنر بھی

☆ (شہرِ محبت).Virginia For Lovers

○

جو محبت کی جان ہوتے ہیں
سونے چاندی کی کان ہوتے ہیں

اِن حسینوں کی بات مت پوچھو
شہر کی آن بان ہوتے ہیں

کیسی ہوتی ہیں قربتیں بھی عجیب
فاصلے درمیان ہوتے ہیں

دِل ہو آباد یہ ضروری ہے
بے مکیں کب مکان ہوتے ہیں

قیس و فرہاد جیسے اہلِ جنوں
شَرَفِ خاندان ہوتے ہیں

جو بھی سچ بولنے کے مجرم ہیں
اپنے دِل کی زبان ہوتے ہیں

اے خدا اُن کے گھر رہیں آباد
ہم جہاں میہمان ہوتے ہیں

○

جو خوش لباس بدن منظروں میں رکھّے ہیں
وہ چشمِ شوق ترے کیمروں میں رکھّے ہیں

وہ حُسن ہے کہ کسی طور کم نہیں ہوتا
عجیب وصف پری پیکروں میں رکھّے ہیں

ہر آدمی نے بنایا ہے ایک بُت کو خدا
وہ بُت الگ ہیں جو اِن مندروں میں رکھّے ہیں

مسافتیں ہیں کہ چلنے سے کم نہیں ہوتیں
محبتوں کے سفر دائروں میں رکھّے ہیں

کمالِ ذات خدا کم کسی کو دیتا ہے
یہ اُس نے اپنے ہی پیغمبروں میں رکھّے ہیں

جو بڑھتے رہتے ہیں ہر آن کم نہیں ہوتے
کچھ ایسے دکھ بھی ہمارے گھروں میں رکھّے ہیں

یہ آپ مر کے بھی لیتے ہیں جان اوروں کی
نئے ستم ہیں جو دہشت گروں میں رکھّے ہیں

عجیب طرح کے ظالم ہمارے عہد کے ہیں
کہ اپنی مشقِ سخن ڈالروں میں رکھّے ہیں

یہ بے بساط سے طائر بھی حفظِ جاں کے لیے
اُڑان بھرنے کی طاقت پروں میں رکھّے ہیں

ہمارے پاس دِلِ آئینہ صفات کہاں
ہم اعتقاد تو شیشہ گروں میں رکھّے ہیں

بدلتے رہتے ہیں خود مطمحِ نظر اپنا
یہ وہ ہنر ہیں جو دانشوروں میں رکھّے ہیں

وہ نقشے جن سے کہ بنتے تھے سارے منصوبے
وہ فائلوں میں ہیں اور دفتروں میں رکھّے ہیں

ہمارے شہر میں ہم نام ہیں ہمارے کئی
سو ہم شناخت الگ باقروں میں رکھّے ہیں

○

حُسن سے رسم و راہ کوئی نہیں
سر تو ہے سجدہ گاہ کوئی نہیں

بارِ احساں سے سر جُھکا رہتا
شُکر ہے خیر خواہ کوئی نہیں

سلکِ الفت میں دِل بندھیں کیسے
بندھنوں کی گیاہ کوئی نہیں

اب مرا شہر سارا مقتل ہے
اب یہاں قتل گاہ کوئی نہیں

بھرے بازار میں جو خون ہوا
اُس کا عینی گواہ کوئی نہیں

لوگ انصاف سے ہوئے مایوس
اب یہاں داد خواہ کوئی نہیں

جو بھی ہونی ہے اُس کا ہونا ہے
بے سبب خواہ مخواہ کوئی نہیں

سب ہیں اولادِ آدم و حوّا
بے خطا بے گناہ کوئی نہیں

بحرِ الفت میں ڈوب کر دیکھو
اِس سمندر کی تھا ہ کوئی نہیں

حُسن ہی ایک دیکھنے کی ہے چیز
بد نظر بد نگاہ کوئی نہیں

ساری خلقت ہوئی برہنہ سر
کجکلاہی کُلاہ کوئی نہیں

مسجدوں میں بھی جانکلتے ہیں
ہم سا گم کردہ راہ کوئی نہیں

دِل کو بس حُسن کی امان میں دو
اور اِس کی پناہ کوئی نہیں

میکدے میں پڑھے گا شیخ نماز
راہ میں خانقاہ کوئی نہیں

ہے بڑا ہی کٹھن سفر درپیش
ہاتھ میں زادِ راہ کوئی نہیں

سب خمینی کی راہ پر نکلے
اب طرفدارِ شاہ کوئی نہیں

میرؔ صاحب ہیں اور نہ سوداؔ ہیں
شعر میں آہ واہ کوئی نہیں

عورتوں کا مشاعرہ تو سنا
اُن میں زُہرہ نگاہ کوئی نہیں

اتنے سارے سخن شناسوں میں
جو کرے واہ واہ کوئی نہیں

نفرتیں چار سمت ہیں باقرؔ
چشمِ الفت نگاہ کوئی نہیں

○

جُز حُسن کسی شے کی تمنّا نہیں کرتے
ہم اہلِ نظر اور تماشہ نہیں کرتے

ہر کام میں ہم ہاتھ بھی ڈالا نہیں کرتے
کرنے پہ جو آجائیں تو پھر کیا نہیں کرتے

وہ دستِ طلب کیسے بڑھاتے کہیں اپنا
جو قرض تو دیتے ہیں تقاضہ نہیں کرتے

ہے شہر میں وہ خوف کہ لوٹ آتے ہیں دن سے
پھر گھر سے نکلنے کا ارادہ نہیں کرتے

کیا دستِ شفا ہے کہ بڑھاتا ہے مَرَض اور
تم خوب مسیحا ہو کہ اچھا نہیں کرتے

دیدار طلب اپنی نگاہیں بھی ہیں لیکن
موسیٰ کی طرح عرضِ تمنّا نہیں کرتے

ایسے بھی ہیں کچھ دوست کہ آتے نہیں برسوں
آجائیں تو جانے کا ارادہ نہیں کرتے

یہ حُسنِ نظر ہی کا تقاضہ ہے کہ باقرؔ
آئینہ کبھی شوق سے دیکھا نہیں کرتے

○

اُن سے دادِ وفا جو پائی ہے
دِل کی جیسے مراد آئی ہے

سوگیا ہوں ترے خیالوں میں
بعد مدّت کے نیند آئی ہے

جِن کو خود راستوں کا علم نہیں
اُن سے امیدِ رہنمائی ہے

کچھ نہیں وجہِ دوریِ منزل
صرف اپنی شکستہ پائی ہے

حُسن کی بے حجابیوں کا سبب
حُسن کا ذوقِ خود نمائی ہے

ہم سے مِل کر تو دیکھ جانِ وفا
ہم سے امکانِ بے وفائی ہے

راز کی بات کیوں کسی سے کہو
منہ سے نکلی ہوئی پرائی ہے

یہ روایت ہے نسلِ آدم کی
وہی قاتل بھی ہے جو بھائی ہے

آپ ہی دِل کی بات سُن لیجے
آپ سے زعمِ آشنائی ہے

کچھ تو نرمی مزاج میں رکھیے
یہ درشتی کہاں سے آئی ہے

بے سبب ہی نہ جانے کیوں باقرؔ
شعر گوئی کی دُھن سمائی ہے

○

تری نظر کا کرشمہ ، ترے شباب کا جوش
شراب پی بھی نہیں اور ہوگئے مدہوش

ہے کوئی یار پرانا نہ کوئی حلقہ بگوش
کوئی نہیں ہے جو ہوتا ہمارے دوش بدوش

وہی جری ہے اُسی کے لیے نویدِ سروش
جو انتشار کے لمحوں میں رہ سکے با ہوش

اُنھیں ، جنھیں تھا بڑا زَعمِ حُسنِ گویائی
تمھاری بولتی آنکھوں نے کردیا خاموش

وطن کی خاک ترے جانثار کم تو نہیں
نجانے کتنے نکل آئیں گے کفن بر دوش

ہم ایسے لوگ بھلا کب روش بدلتے ہیں
زمانہ لاکھ ہمارے خلاف ہو سر گوش

سمندروں کا تلاطُم چھپائے بیٹھے ہیں
جو تیری بزم میں بیٹھے ہیں اِس قدر خاموش

بچھڑ کے اُس سے جو گزری وہ کیا کہیں باقرؔ
نہ کوئی زلف کا سایہ ، نہ وا کوئی آغوش

(۱۳ اپریل ۱۹۸۷ء بمقام کویٹہ)

○

شاعر سب کا دکھ اپنائے پھرتا ہے
دھرتی ماں کا بوجھ اُٹھائے پھرتا ہے

شانوں پر زلفیں لہرائے پھرتا ہے
حُسن دلوں کے دیپ جلائے پھرتا ہے

گورا مکھڑا ڈال دے جس پر ایک نظر
وہ پھر جیون بھر گھبرائے پھرتا ہے

جانے کتنے بھیدوں کا بیوپار کرے
گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے پھرتا ہے

مجنوں پر اِس جگ میں کیسی بیت گئی
بھول کے سارے اپنے پرائے پھرتا ہے

ظالم اپنی طاقت کے بَل بُوتے پر
دنیا بھر میں آگ لگائے پھرتا ہے

مَن کی دنیا ہی سُکھ چین کی نگری ہے
پاپی مَن جگ جگ پچھتائے پھرتا ہے

اُس کو آخر بھیک تو مل ہی جاتی ہے
جو اپنا دامن پھیلائے پھرتا ہے

مَن سانچا تو سب سانچا کہتے ہیں بڑے
مَن کا کھوٹا، کھوٹ چُھپائے پھرتا ہے

پاپ کرو تو پچھتاوے تو ہوتے ہیں
مورکھ من کا بوجھ اُٹھائے پھرتا ہے

سانجھ ہوئی تو لوٹ پکھیرو آتے ہیں
رات کا جگنو چمک دکھائے پھرتا ہے

باقرؔ کو جانے یہ کیسا روگ لگا
چندن خوشبو من میں بسائے پھرتا ہے

اپنی دنیا آپ بنائی ہے اُس نے
اپنی ارتھی آپ اُٹھائے پھرتا ہے

جتنی موہنی شکلیں اُس نے دیکھی ہیں
من مندر میں سب کو بٹھائے پھرتا ہے

ہاتھوں میں ہیں کچھ غزلوں کے شبد لکھے
محفل محفل رنگ جمائے پھرتا ہے

(اپنے گھر کے خاندانی مشاعرے کے لیے۔ ۳۱ جولائی ۲۰۰۹ء)

○

اِدھر اُدھر سے بھٹک کر کدھر گیا ہوں میں
اُسی کو ڈھونڈتا نکلا، جدھر گیا ہوں میں

نویدِ نُور لیے شب گزیدہ لوگوں میں
مثالِ آمدِ وقتِ سحر گیا ہوں میں

محبتوں میں تکلّف کا کام ہی کیا تھا
جِدھر کسی نے پکارا اُدھر گیا ہوں میں

صعوبتوں نے سفر میں مزاج پُرسی کی
جہاں بھی جب بھی بِنا ہمسفر گیا ہوں میں

ہمیشہ اپنے اصولوں کی پاسداری کی
جہاں ضمیر نے ٹوکا ، ٹھہر گیا ہوں میں

مکین اب کے کچھ ایسے تپاکِ جاں سے ملے
زمانے بعد لگا ہے کہ گھر گیا ہوں میں

محبتوں میں صدا دل میں وسعتیں رکھیں
جو چاہتوں کی تھی کرنی وہ کر گیا ہوں میں

مری حیات میں کچھ پیچ و خم نہیں آئے
جو سیدھی راہ تھی اُس راہ پر گیا ہوں میں

یہی تو ربطِ مسلسل ہے نسلِ آدم کا
میں آیا تھا تو پسر تھا ، پدر گیا ہوں میں

نہ جانے کون ہو کب خودکُشی پہ آمادہ
کچھ آج اپنے ہی لوگوں سے ڈر گیا ہوں میں

رفاقتوں کے یہ نُبھرنے بھگتنے پڑتے ہیں
وہ میری نسل بھرے گی جو کر گیا ہوں میں

اب اُس مقام کا نام و نشاں نہیں ملتا
وہ راہِ دل جہاں شام و سحر گیا ہوں میں

یہ دَین ہے تو سیاست مدار رہبر کی
کہ اپنی بات کو کہہ کر مکر گیا ہوں میں

انانیت سے نہیں پورے انکسار کے ساتھ
جہاں گیا ہوں بصد کرّ و فر گیا ہوں میں

سخن شناس ہی جوہر شناس ہیں باقرؔ
سماعتوں میں دلوں کی اُتر گیا ہوں میں

(اپنے گھر کے خاندانی مشاعرے منعقدہ ۳۱ جولائی ۲۰۰۹ء میں پڑھی)

○

حاصل جو حسینوں کی رفاقت نہیں ہوتی
ہم سے تو بسر ایک بھی ساعت نہیں ہوتی

آباد ہی رہتا ہے سدا شہرِ تمنّا
کم دل سے بتوں کی کبھی چاہت نہیں ہوتی

وہ پھول سا اندام ، وہ دل کش قدِ زیبا
قامت نہ نکلتی تو قیامت نہیں ہوتی

سورج کی شُعاعوں سے بدن کرتے ہیں اَشنان
اب دھوپ میں اگلی سی تمازت نہیں ہوتی

جو بات غلط ہو وہ اٹکتی ہے زباں پر
سچ بولنے والوں کو تو لُکنت نہیں ہوتی

اولاد پہ ممتا کی نظر ابرِ کرم ہے
بن ماں کی دعاؤں کے تو رحمت نہیں ہوتی

انسان کہاں بنتا ، وہ فرعون ہی ہوتا
انساں کو جو انساں کی ضرورت نہیں ہوتی

سائے سے بزرگوں کے نہ محروم ہوں بچّے
گھر ہو نہیں سکتا وہ جہاں چھت نہیں ہوتی

اُس فصل سے دہقان کو اللہ بچائے
محنت ہی جہاں اُس کی سُوارت نہیں ہوتی

ہر حال میں اشلوک تو پڑھنا ہیں ضروری
بے حرفِ دعا ، کوئی عبادت نہیں ہوتی

جو قاتل و خود کُش ہو ، جہادی نہیں ہوتا
خود کُش کے مقدّر میں شہادت نہیں ہوتی

امت کے مسلمانوں کو دے قتل کے فتوے
ایسی تو محمدؐ کی شریعت نہیں ہوتی

سچ یہ ہے کہ جنّت سے نہ کم تھی یہی دنیا
بس ایک جہالت کی جو لعنت نہیں ہوتی

وہ ہم ہیں جو ہر عہد میں دہشت کا ہدف تھے
سو اپنے قبیلے میں تو دہشت نہیں ہوتی

سیمیں بدَناں آج بھی محبوبِ نظر ہیں
اُن سے تو کبھی سیر طبیعت نہیں ہوتی

یہ امنِ مجسّم ہے ، محبت کا امیں ہے
دشمن سے بھی باقرؔ کو عداوت نہیں ہوتی

(اپنے گھر کے خاندانی مشاعرے منعقدہ ۳۱ جولائی ۲۰۰۹ء میں پیش کی)

○

ہم تو چاہیں ہیں بہت وہ یہ مگر کب چاہے
اُس کی قُربت تو میسّر ہو اگر رب چاہے

سننے والا ہی نہ تھا کوئی تو خاموش تھے ہم
بولنے والا مقابل میں مخاطَب چاہے

گھر کا دروازہ کُھلا رکھا ہے ہم نے اپنا
شوق سے آئے یہ گھر اُس کا ہے وہ جب چاہے

جلوہ گر جس کا سراپا ہے مری غزلوں میں
وہ ہی مجھ سے مرے اشعار کا مطلب چاہے

اتنا محروم نہ رکھ ، تیرا حوالہ تو رہے
بخش دے جو بھی ہو دکھ سُکھ ہوں ترے سب چاہے

پاس رہتا ہوں تو کرتا نہیں ملنے کی سبیل
شہر سے دُور ہوں ، ملنا وہ مجھے تب چاہے

اپنی اس سخت مزاجی پہ پشیماں ہے تو پھر
اب بھی ہم اُس کے ہیں باقرؔ وہ اگر اب چاہے

(۲۴ اپریل ۱۹۸۷ء بمقام کویٹہ)

○

کسی کی مہر میں تھا ، اور کسی کے قہر میں تھا
میں کیا بتاؤں کہ خشکی پہ تھا کہ نہر میں تھا

دلوں میں گَردِ کدورت ، لبوں پہ خاموشی
بڑے فساد کا ساماں سکوتِ شہر میں تھا

سوائے کاہشِ ہستی کسی نے کیا پایا
مزاجِ یار کا پَرتو ، مزاجِ دہر میں تھا

وہ ہم ہی تھے کہ رہے ہر نظر میں بیگانے
کوئی مزاج شناسا نہ سارے شہر میں تھا

تلاش کرلیا سچّائیوں کی تلخی نے
وہ راز آبِ بقا کا جو جامِ زہر میں تھا

عجیب پاسِ وفا تھا ، پیا نہیں پانی
وہ تین روز کا پیاسا اگرچہ نہر میں تھا

نہ جانے کون سی راہوں پہ چل پڑے دونوں
وہ اپنی موج میں تھا اور میں اپنی لہر میں تھا

ہمارے عہد کا ذوقِ سخن سبحان اللہ
اُسے بھی کہہ دیا مُہمل جو شعر بحر میں تھا

خوشا وہ وقت کہ منزل قریب تھی باقرؔ
کہ اہلِ ذوق کا مسکن سوادِ شہر میں تھا

(۲۰ مئی ۱۹۸۷ء، بمقام کویٹہ)

○

بزمِ ناز سے اپنی جب کوئی اُٹھاتا ہے
پھر قدم نہیں اُٹھتے دِل ہی بیٹھ جاتا ہے

اپنے ہر تبسّم سے بجلیاں گراتا ہے
کتنے پھول کِھلتے ہیں جب وہ مسکراتا ہے

جس کی شعر فہمی نے ہم کو کردیا شاعر
کیا کبھی ہمارے بھی شعر گنگناتا ہے

ایک دن کبھی اُس سے روٹھ کر یہ دیکھیں گے
خود بھی روٹھ جاتا ہے یا ہمیں مناتا ہے

اک چراغِ دانش ہی روشنی کا ضامن ہے
آندھیوں کی زد پر بھی جو جلے ہی جاتا ہے

کوئی بات بنتی ہے، کوئی آس بندھتی ہے
عرضِ مدعا سن کر جب وہ مسکراتا ہے

باقر اپنی منزل کا اُس سے کیا پتہ پوچھیں
جان بوجھ کر بھی جو کچھ کا کچھ بتاتا ہے

(۲۲ مئی ۱۹۷۸ء بمقام کوئٹہ)

○

کب محبت کی جستجو نہ رہی
کب حَسینوں کی آرزو نہ رہی

مسجدوں کی طرح اُجاڑ ہوئے
میکدوں میں وہ ہاؤ ہو نہ رہی

اور کیا رہ گیا زمانے میں
جب محبت کی آبرو نہ رہی

اُس کی آنکھوں کے میکدے توبہ
خواہشِ ساغر و سبو نہ رہی

میری باہیں اُجاڑنے والے
دیکھ لے رونقِ گُلو نہ رہی

سب ہوا تار تار پیراہن
اب ہمیں حاجتِ رفُو نہ رہی

زندگی میں وہ اِس طرح آیا
پھر کوئی اور آرزو نہ رہی

جس نے رشتوں کی کچھ پرکھ کرلی
پھر وہ بیٹی بنی بہو نہ رہی

آج بھی چُپ ہیں حضرتِ باقر
کیوں وہ اگلی سی گفتگو نہ رہی

(۱۵ جون ۱۹۸۷ء بمقام کوئٹہ)

○

کسی طرح تو محبت کی ترجمانی ہو
نئی نہ ہو تو روایت کوئی پرانی ہو

کبھی تو راحتِ جاں میہمان ہو اپنا
کبھی تو شام ہماری کوئی سُہانی ہو

لغت میں حرف کہاں ہیں جو حق ادا کر دیں
تو کس طرح مرے جذبوں کی ترجمانی ہو

کہاں زمان و مکاں میں وہ لامکاں باقرؔ
مگر وہ دِل ہے ہمارا جہاں مکانی ہو

(۲۳ جون ۱۹۸۷ء بمقام کویٹہ)

○

باقرؔ صاحب لاکھ چھپائیں ، دِل میں کچھ ہیجان تو ہے
آپ بھی آخر دل والے ہیں ، دِل ہے تو ارمان تو ہے

جس کے تھے سب خواب سُہانے ، ہر ڈالی گُلدستہ تھی
جانے کیوں وہ شہرِ نگاراں ، کچھ دن سے ویران تو ہے

کب تک ہم آوارہ پھرتے ، وقت گنواتے سڑکوں پر
آپ نے ہم کو ہم سے ملایا ، آپ کا یہ احسان تو ہے

اِک درِ زنداں کھول کے دیکھو کتنے اسیر اور آتے ہیں
دِل والوں نے سوچ لیا ہے گھر نہ سہی زندان تو ہے

گال شہابی ، ہونٹ گلابی ، کالی زلفیں ، گورا بدن
رنگوں کی دوکان ہو جیسے ، آئینہ حیران تو ہے

اُس کی رسوائی کے ڈر سے اُس کا حوالہ دے نہ سکے
اُس کی ذات سے ہٹ کر بھی تو، اپنی کوئی پہچان تو ہے

لاکھ کتابیں بھری پڑی ہیں، سفّاکی کے قصّوں سے
جب چاہے بن جائے درندہ، انساں بھی حیوان تو ہے

خود داری سے جینا چاہے، خود داری پر جانیں دے
اور بھی کوئی مُلک ہو شاید، ایک مگر ایران تو ہے

یوں تو ہم ہی سب سے بُرے ہیں، مَن میں لیکن کھوٹ نہیں
اچھے بُرے کی آپ کو آخر تھوڑی سی پہچان تو ہے

شاعری گو آسان نہیں ہے پھر بھی کچھ تو خیال رکھا
جن شعروں میں جان نہیں ہے، اُن میں لطفِ زبان تو ہے

○

یہی آرزو ، یہی جستجو ، کبھی ہم کلام کوئی تو ہو
کبھی آ کے ہم سے کہے تو کچھ، کبھی ہم سے کام کوئی تو ہو

کبھی ہم سے یوں بھی خطاب ہو کہ نہ آپ ہو نہ جناب ہو
کوئی نام لے کے پکار لو کہ ہمارا نام کوئی تو ہو

کوئی ٹھنڈی ٹھنڈی سی چھاؤں ہو بڑی دھوپ ہے ذرا دن ڈھلے
کوئی آ کے زلفوں کو کھول دے کہ نویدِ شام کوئی تو ہو

کوئی دوستی ہے نہ دشمنی ، کسی سمت میں ہو سفر تو ہو
کسی راستے پہ چلے کوئی ، رہِ خاص و عام کوئی تو ہو

یہ اکیلا پَن ، یہ اُجاڑ گھر ، یہاں یار کوئی نہ آشنا
کوئی ساتھ ہو تو مزہ بھی ہے کہ شریکِ جام کوئی تو ہو

وہ جو ہم سے رہتا ہے بدگماں ، وہی اپنی جان کا روگ ہے
اُسے دِل نے اپنا سمجھ لیا ، خَلِشِ دوام کوئی تو ہو

(۷ جولائی ۱۹۸۷ء بمقام کوئٹہ)

○

جب نظر حُسن رَسا ہوتی ہے
ہر قدم لغزشِ پا ہوتی ہے

اُس کے ملبوسِ بدن کی خوشبو
کِس قدر ہوش رُبا ہوتی ہے

خود کو خود سے ہی چُھپا رکھنے میں
کیا ستمگر سی ادا ہوتی ہے

سُرخ پھولوں پہ ہو شبنم جیسے
عارضوں پر وہ حیا ہوتی ہے

اب کہاں وہ نگہِ مہر کہ جو
دونوں عالم سے سوا ہوتی ہے

منہ سے نکلے نہ کوئی حرفِ طلب
کیسی خود دار انا ہوتی ہے

وہ سمجھتا ہے دل وجاں کا مزاج
اُس کی آنکھوں میں حیا ہوتی ہے

کیا کہیں اُس کی بوئے زُلف دراز
نکہتِ گُل سے سوا ہوتی ہے

(۱۶ جولائی ۱۹۸۷ء، بمقام کوئٹہ)

○

دستِ محبوب سے کب رنگِ حنا مانگتے ہیں
اپنی چاہت کا صلہ اہلِ وفا مانگتے ہیں

وہ جو احسان و عنایت کا صلہ مانگتے ہیں
کیسے نادان ہیں اِس عہد میں کیا مانگتے ہیں

اور کیا اِس کے سِوا میرے خدا مانگتے ہیں
خیر ہی خیر ہے جو تجھ سے سدا مانگتے ہیں

ہم کو محروم جو رکّھا تو پشیمان ہے کیوں
ہم تو اب بھی ترے جینے کی دعا مانگتے ہیں

یوں تو ہر سَمت سے آتی ہیں صدائیں لیکن
کان مانُوس ہیں جس سے وہ صدا مانگتے ہیں

وقتِ رخصت تو کرو خواہشِ تجدیدِ وصال
جب بچھڑتے ہیں تو ملنے کی دعا مانگتے ہیں

سامنے اُس کے ہی پھیلا ہے مرا دستِ سوال
وہ سخی جس سے سبھی شاہ و گدا مانگتے ہیں

اُس کی تشویش عبث ہے کہ ہم اُس سے باقرؔ
کب محبت کے تقاضوں سے سِوا مانگتے ہیں

(نومبر ۱۹۸۷ء، بمقام کوئٹہ)

○

ہوگی اُس کو بھی ہم سے چاہ بہت
دِل کو ہوتی ہے دِل سے راہ بہت

اِس قدر پاک دامنی نہ دِکھا
ہم نے دیکھے ہیں بے گناہ بہت

ہم کسی سے نہیں زیادہ طلب
ہم کو اِک پیار کی نگاہ بہت

پاس بیٹھے تو اجنبی سا لگے
اور دیکھو تو رسم و راہ بہت

زندگی چند روز کی مہلت
اور محبت ہے بے پناہ بہت

آپ سے کہتے بَن نہیں پڑتی
دِل کو ہے حسرتِ گناہ بہت

جب کبھی عیب تھی برہنہ سری
تب ہی ہوتے تھے کج کلاہ بہت

اُن کی نسبت سے سرخ رُو ہے حیات
ورنہ ہم جیسے رُوسیاہ بہت

دِل کا ماتم ہے شاعری باقرؔ
پھر بھی ہوتی ہے واہ واہ بہت

(نومبر ۱۹۸۷ء بمقام کوئٹہ)

○

جب بھی منہ کھولو امرت رَس گھولو
میٹھی بات کرو آہستہ بولو
تازہ ہوا آئے دروازہ کھولو
دیکھو شام ہوئی جُوڑا مت کھولو
رات کے جاگے ہو تھوڑا سا سو لو
موسم اچھا ہے آج اِدھر ہو لو
ناؤ نہیں ہو تم ایسے مت ڈولو
سب ہی تمھارا ہے جو چاہو سو لو
بوجھ ہو جب دِل پر تھوڑا سا رو لو
آنسو موتی ہیں یہ آنسو رو لو
اتنا مت روؤ اُٹھو منہ دھولو

ہم بھی روٹھ گئے
جاؤ مت بولو

○

مرد و زن کولھو میں پلوائے گئے
لوگ دیواروں میں چنوائے گئے

بن چکیں جب یادگاریں شاہکار
ہاتھ معماروں کے کٹوائے گئے

بھوک سے خلقِ خدا مرتی رہی
لعل و زر مٹّی میں دفنائے گئے

ظلم کی راہوں میں پھولوں سے قدم
فرش پر کانٹوں کے چلوائے گئے

کوچۂ دلدار ہو یا دار ہو
اہلِ دِل ہی ہر جگہ پائے گئے

جس کی رونق ہی ہمارے دم سے تھی
ہم اُسی محفل سے اُٹھوائے گئے

دانش و دانشوری کے نام پر
مسئلے کچھ اور اُلجھائے گئے

قدر انساں کی گھٹانے کے لیے
لوگ مال و زر میں تُلوائے گئے

جن کے رہتے تھے دِل و جاں منتظر
وہ بھی یوں آئے کہ بس آئے گئے

کیا بتائیں اُس کے در پر کتنی بار
ہم نہ ملنے کی قسم کھائے گئے

شام آئی ہو گیا سورج غروب
رہ گئی دیوار اور سائے گئے

○

کسی سے دِل لگاؤ تو کبھی یہ چوٹ کھاؤ تو
کسی کا دکھ بٹاؤ تو کسی کے کام آؤ تو
ذرا قریب آؤ تو جو دِل میں ہے بتاؤ تو
صبح سے شام ہوگئی ذرا سا مسکراؤ تو
کسی نے بھی لگائی ہو اِس آگ کو بجھاؤ تو
مٹے گی دشمنی یوں ہی بڑھو گلے لگاؤ تو
شریکِ غم کرو ہمیں حدیثِ دِل سناؤ تو
دلوں کے قافلے چلیں یہ راستہ سُجھاؤ تو
تمھارے تھے، تمھارے ہیں اُٹھاؤ تو گراؤ تو
پھلے گا نخلِ آشتی مگر شجر لگاؤ تو
یہ دوستی وہ دشمنی اب آؤ تو نہ آؤ تو
ستارے توڑ لائیں گے ذرا نظر ملاؤ تو
یہ چھوٹی بحر ہے تو کیا غزل ہے گنگناؤ تو
زمیں بڑی کشادہ ہے نئے نگر بساؤ تو

جو تم کہو وہی کریں
اب آ کے تم نہ جاؤ تو

○

قد قیامت ، بدن بلا کا ہے
رزقِ شعر و سخن بلا کا ہے

قندِ لب کا مزہ ہے باتوں میں
یار شیریں دَہَن بلا کا ہے

ساری رنگینیاں غزل کی نثار
اُس کا سادہ سخن بلا کا ہے

سب اُسی سے ہے بزم آرائی
آپ وہ انجمن بلا کا ہے

بُت بہت ہیں تو کیا بفضلِ خدا
دل بھی تو برہمن بلا کا ہے

ہم بھی اِک عہد روز لیتے ہیں
وہ بھی وعدہ شکن بلا کا ہے

ہجرِ حوّا میں گریۂ آدم
رشتۂ مرد و زن بلا کا ہے

عام ہے فیضِ کاکل و رخسار
شغلِ دار و رسن بلا کا ہے

تیشۂ عزمِ کوہسار شکن
قصّۂ کوہ کن بلا کا ہے

شدّتِ شعر و شاعری ہے مگر
یہ بھی آشوبِ فن بلا کا ہے

کارِ طفلاں نہیں ہے کارِ سخن
رن بلا کا ہے بن بلا کا ہے

مِل رہے ہیں گلے جدید و قدیم
اپنا رنگِ سخن بلا کا ہے

○

دارِ رنج و محن بلا کا ہے
جو چمن تھا وہ بن بلا کا ہے

باغباں خود گلوں کا خون کرے
یہ شعارِ چمن بلا کا ہے

کسی آسیب کا اثر تو نہیں
ہر روش ہر چلن بلا کا ہے

لوٹ لیتا ہے اپنے ہی گھر کو
راہبر راہزن بلا کا ہے

مرمٹے سب ہی جامہ زیبی پر
جھوٹ کا پیرہن بلا کا ہے

کیا ہیں اور کیا دکھائی دیتے ہیں
خرقہ ٔ مکر و فن بلا کا ہے

گودیں اُجڑی ہیں کتنی ماؤں کی
وہ بگیرو بزن بلا کا ہے

کُنڈلیاں مارے سانپ بیٹھے ہیں
مَن بلا کا ہے، پھن بلا کا ہے

جو وطن میں بھی اجنبی ہی رہے
وہ غریب الوطن بلا کا ہے

کون سنتا ہے نالہ ٔ بلبل
شورِ زاغ و زغن بلا کا ہے

○

دِل کہیں مبتلا نہیں ملتا
اب کوئی در کُھلا نہیں ملتا

دشمنی ہم سے ہو نہیں سکتی
دوستی کا صلہ نہیں ملتا

کوئی اپنا تو ہو زمانے میں
بُت ملیں گر خدا نہیں ملتا

جو مقدّر میں ہے وہ ملتا ہے
اور اِس کے سوا نہیں ملتا

آپ اپنی مثال آپ ہی ہیں
آپ سا دوسرا نہیں ملتا

اب محبت کی جستجو نہ کرو
آندھیوں میں دیا نہیں ملتا

حد ہے کچھ ایسی نامرادی کی
لب پہ حرفِ دعا نہیں ملتا

وقت کچھ ایسا آ پڑا مجھ پر
اپنے گھر کا پتہ نہیں ملتا

○

عقل نے کچھ مری مدد ہی نہ کی
عشق نے دِل کی بات رَد ہی نہ کی

واعظوں کو بھی ساتھ بٹھلایا
کبھی تفریقِ نیک و بد ہی نہ کی

دِل دُکھایا نہیں حسینوں کا
پیش کش کوئی مسترد ہی نہ کی

جس نے جیسا کہا وہ مان لیا
کبھی یاروں سے ردوکد ہی نہ کی

وہ ہمارا فقیہہِ شہر بنا
جس نے اِک بات مستند ہی نہ کی

اُس کی خوش قامتی قیامت تھی
سرو و سُنبُل نے فکرِ قد ہی نہ کی

دشمنوں نے خیال رکھّا بہت
دوستوں نے کبھی مدد ہی نہ کی

○

کچھ اور کام نہیں ہے چلو غزل ہی کہیں
وہ آج شام نہیں ہے ، چلو غزل ہی کہیں

خوشا یہ لمحۂ موجود ، اپنی فکرِ رَسا
اسیرِ دام نہیں ہے ، چلو غزل ہی کہیں

اکیلے گھر میں بھلا میکشی کا لطف ہی کیا
شریکِ جام نہیں ہے ، چلو غزل ہی کہیں

خیال دوست ٹہر ، کوئی لمحہ ٔ فرصت
ہمارے نام نہیں ہے ، چلو غزل ہی کہیں

کبھی تو ہجر کے صدموں سے جان چھوٹے گی
خیالِ خام نہیں ہے ، چلو غزل ہی کہیں

جو دِل پہ چوٹ نہ کھائے غزل نہیں کہتا
سبھی کا کام نہیں ہے ، چلو غزل ہی کہیں

نہیں ہے وہ تو بڑا دِل اداس ہے باقؔر
فروغِ بام نہیں ہے ، چلو غزل ہی کہیں

(۵ فروری ۱۹۸۹ء بمقام کراچی)

○

کسی کا عہدِ رفاقت وفا ہوا ہی نہیں
جسے میں سمجھا تھا اپنا مرا ہوا ہی نہیں

یہ ٹھیک ہے کہ محبت نے راستے بدلے
مگر وہ شخص تو دِل سے جدا ہوا ہی نہیں

تمام عمر کا حاصل وہ ایک سجدہ ہے
ابھی جو میری جبیں سے ادا ہوا ہی نہیں

مرے خدا کا یہی ہے کمالِ صنّاعی
تم ایسا اور کوئی دوسرا ہوا ہی نہیں

خیالِ دوست نے ہر آن دستگیری کی
غمِ جہاں تو کبھی رہ نما ہوا ہی نہیں

وہ شخص گریۂ شب کا سُرور کیا جانے
جو پچھلی رات میں محوِ بُکا ہوا ہی نہیں

ابھی تو جیب و گریباں سبھی سلامت ہیں
ابھی تو جشنِ بہاراں بپا ہوا ہی نہیں

بس ایک بار اُسے یوں منالیا ہم نے
کہ اُس کے بعد کبھی وہ خفا ہوا ہی نہیں

جواب دیتا رہا دہشتوں کا دہشت سے
زمانہ واقفِ مہر و وفا ہوا ہی نہیں

یزیدیوں نے زمانے کے، ظلم ڈھائے مگر
دوبارہ معرکۂ کربلا ہوا ہی نہیں

گلہ نہیں ہے فقط عرضِ حال ہے باقرؔ
کوئی ہمارا مزاج آشنا ہوا ہی نہیں

(۷ فروری ۱۹۸۹ء، بمقام کراچی)

○

خلقت پہ ستم اور کوئی پَل ہوگا
یہ عقدۂ مُشکل ہے مگر حَل ہوگا

ہر ظلم کا قانون مُعطّل ہوگا
ہر قریہ پہ انصاف کا بادل ہوگا

خود جا کے صلیبوں پہ چڑھیں گے اب لوگ
اب جشنِ بہاراں سرِ مقتل ہوگا

ہر ساعتِ موجود گزر جائے گی
یہ دستِ ستمگر بھی کبھی شَل ہوگا

تھمنے ہی کو ہے ظلم و ستم کی آندھی
پھر ابرِ بہار آئے گا جَل تھَل ہوگا

مزدور کو مل جائے گا محنت کا ثمر
جو آج نہیں ہوسکا وہ کَل ہوگا

مظلوم کہیں ہوگی نہ جب خلقِ خدا
صدیوں میں اِک ایسا بھی کوئی پَل ہوگا

بدلے گا کوئی آکے زمانے کا نظام
انسان نہ اُس دور میں بیکَل ہوگا

(۸فروری ۱۹۸۹ء بمقام کراچی)

○

رند بھی مقتدر نہ تھا اتنا
شیخ بھی معتبر نہ تھا اتنا

کیا زمانے میں احترام ملا
پاس کوئی ہنر نہ تھا اتنا

ایک اِک پَل کی تھی خبر اُس کو
ہم سے وہ بے خبر نہ تھا اتنا

سننے والوں کو نیند آ ہی گئی
قصّہ بھی مختصر نہ تھا اتنا

حُسن سے بھی شکایتیں تو رہیں
عشق بھی بے ضرر نہ تھا اتنا

وہ ملا ، آ گئی قریں منزل
ہم سفر تھا سفر نہ تھا اتنا

چاہتا وہ تو آ بھی سکتا تھا
اُس سے کچھ دور گھر نہ تھا اتنا

نفرتیں پھیل کر کہاں پہنچیں
چاہتوں کا اثر نہ تھا اتنا

روز کہتے نئی غزل باقرؔ
شوق تو تھا مگر نہ تھا اتنا

(جولائی ۱۹۸۹ء بمقام کراچی)

○

وقفِ فریاد بھی نہیں رہتا
دِل مگر شاد بھی نہیں رہتا

ایک وہ ہے کہ بھولتا ہی نہیں
اور کچھ یاد بھی نہیں رہتا

موت سب کو نصیب ہوتی ہے
زندہ جلاد بھی نہیں رہتا

جب جہالت کا دور دورہ ہو
کوئی استاد بھی نہیں رہتا

اتنا تنہا ہوں میں کہ لگتا ہے
ساتھ ہمزاد بھی نہیں رہتا

جب خلف ناخلف سے ہوتے ہیں
ذکرِ اجداد بھی نہیں رہتا

جس میں آسیبِ ہجر بستا ہو
گھر وہ آباد بھی نہیں رہتا

جب بہاریں اُجاڑتی ہیں چمن
پھر تو صیّاد بھی نہیں رہتا

جس کو آزادیوں کی قید ملے
وہ تو آزاد بھی نہیں رہتا

○

قصّہ کسی کا ہم نے سنایا کسی کو تھا
پھر ساری ساری رات جگایا کسی کو تھا

بُھولا نہیں ہے آج بھی بھیگا ہوا بدن
برسات کی رُتوں میں گھمایا کسی کو تھا

لمحوں کا لمس وقت کی گردش پہ تھا محیط
اے بے خودی گلے سے لگایا کسی کو تھا

کیا دیکھتے ہو اب دلِ ویراں کی حالتیں
یہ گھر وہی ہے جس میں بسایا کسی کو تھا

دیکھا بہت ہے زُہد و عبادت کے زَعم کو
کچھ عجزِ بندگی بھی خدایا کسی کو تھا

وہ اپنی ہی نگاہ میں تب سے نہیں اٹھا
جب سے نظر سے تم نے گرایا کسی کو تھا

دہرا دیا کسی نے تو جانِ غزل بنا
باقرؔ تمھارا شعر بھی بھایا کسی کو تھا

○

اپنی محرومی کا ماتم تھا گلہ ہی کیا تھا
ہم کو اِس شہرِ تمنّا نے دیا ہی کیا تھا

ایک افسانہ بنا ڈالا ہے یاروں نے جسے
نظریں ٹکرائیں تھیں بس اور ہوا ہی کیا تھا

کچھ کمی تیری ہی کوشش میں رہی دستِ دراز
اور کُھلتا ، وہ ابھی ایسا کُھلا ہی کیا تھا

صرف نفرت ہی محبت سے بدل ڈالی تھی
اور کچھ راہِ خدا ہم سے ہوا ہی کیا تھا

ساعتیں چند پشیمانی و رسوائی کی
اور میرے لیے دنیا میں رکھا ہی کیا تھا

اُس کو الزام نہ دو نیند تو آجانی تھی
میری بے ربط کہانی میں مزہ ہی کیا تھا

ہم تو پی لیتے اگر زہر بھی ہوتا یارو
اُس کے ہاتھوں سے جو ملتا تو برا ہی کیا تھا

اِک فقط دِل ہی تھا سرشارِ محبت باقرؔ
اور دینے کو مرے پاس رکھا ہی کیا تھا

(۲۵ فروری ۱۹۸۹ء بمقام کراچی)

○

جو بھلا تھا اُسے بھلا سمجھے
جو برا تھا اُسے برا سمجھے

آپ ہی آپ ہیں غزل میں مری
یہ سخن اور کوئی کیا سمجھے

وہ خموشی میں بولتی آنکھیں
کوئی سُن لے اگر تو کیا سمجھے

لذتِ درد کے شناسا تھے
درد کو اہلِ دِل دوا سمجھے

عمر بھر ہم تو اپنے دشمن کو
چھوٹا کہتے رہے بڑا سمجھے

درحقیقت گرا پڑا ہے وہی
جو کسی کو گرا پڑا سمجھے

چھُو کے جاتا ہے یوں بدن اُس کا
لمسِ گُل جس طرح صبا سمجھے

آشنائی اُسی کو آتی ہے
اجنبی کو جو آشنا سمجھے

داب کر ہونٹ پھر کہو اِک بار
آپ کو تو بس اب خدا سمجھے

رونگٹا رونگٹا بدن دیکھا
ہر بُنِ موئے خوش ادا سمجھے

جو نہ سمجھے اُسے بھی ہوتی ہے
اِس محبت کو کوئی کیا سمجھے

رہگزر پر چراغ رکھ آئے
اب دیا سمجھے اور ہوا سمجھے

سب نشیب و فراز دیکھے ہیں
جیسے چہرے کو آئینہ سمجھے

حُسن افزا جو تھا مزاجِ غزل
لوگ ہم کو نہ جانے کیا سمجھے

کیا قیامت تھی صنعتِ صانع
وہ بدن دیکھ کر خدا سمجھے

جو حقیقت شناس ہو باقرؔ
وہ وجوہاتِ کربلا سمجھے

○

بجھے چراغ جلانا اُسی کو آتا ہے
خزاں میں پھول کھلانا اُسی کو آتا ہے

نظر سے برق گرانا اُسی کو آتا ہے
بدن میں آگ لگانا اُسی کو آتا ہے

وہ شعلہ خو ہے بہت جانتا ہے آگ کے کھیل
بدن کو دھوپ لگانا اُسی کو آتا ہے

وہ سامنے ہو تو پھر کچھ نظر نہیں آتا
دل و نگاہ پہ چھانا اُسی کو آتا ہے

سخن عجیب ہیں اُس کے کہ بھولتے ہی نہیں
سماعتوں میں سمانا اُسی کو آتا ہے

متاعِ حسن کو شرم و حیا کے آنچل میں
چھپا چھپا کے دکھانا اُسی کو آتا ہے

اُسی کے آنے سے شاخوں پہ پھول آتے ہیں
بہار اوڑھ کے آنا اُسی کو آتا ہے

جب اُٹھ کے جائے تو دل کا قرار لے جائے
کچھ اِس طرح کا تو جانا اُسی کو آتا ہے

بُتوں کی راہ پہ چلنے لگے خدا والے
حرم کو دَیر بنانا اُسی کو آتا ہے

نظر ملائے تو لکھ دے بیاضِ دل پہ غزل
یہ شاعروں نے بھی مانا اُسی کو آتا ہے

وہ گیت ہو کہ غزل سب اُسی کی باتیں ہیں
ادب کو راہ دکھانا اُسی کو آتا ہے

سلوک کرکے جتانا کسے نہیں آتا
مگر نہ کرکے جتانا اُسی کو آتا ہے

شکستِ دل کا ہُنر کارِ بے خرد تو نہیں
سو وہ بھی ایک ہے دانا اُسی کو آتا ہے

کوئی بتائے کہاں تک مہارتیں اُس کی
ہر ایک کارِ زمانہ اُسی کو آتا ہے

ہمارے پاس کوئی اور کس طرح آئے
ہمارا ٹھور ٹھکانا اُسی کو آتا ہے

○

یہ زحمت بھی کبھی فرمایئے گا
اِدھر آئیں تو ملتے جایئے گا

ابھی آنا اگر ممکن نہیں ہے
تو جب ممکن ہو تب آجایئے گا

مرے خط تو مجھے لوٹا دیے ہیں
مرا دِل بھی کبھی لوٹایئے گا

یہاں سے اب ارادہ ہے کہاں کا
ذرا اتنا بتاتے جایئے گا

ہوا کے دوش پر لہرا کے زلفیں
مہ و خورشید کب گہنائیے گا

سنا ہے کان ہیں دیوار کے بھی
نظر سے گفتگو فرمائیے گا

مجھے سب یاد ہیں اُس شب کی باتیں
زباں اب میری مت کُھلوائیے گا

طلب کی حد نہیں ہوتی ہے باقرؔ
کبھی دامن کو مت پھیلائیے گا

(۱۵ جنوری ۱۹۹۰ء بمقام کراچی)

○

کرتے ہو شکایتیں سبھی کی
تم نے بھی سنی کبھی کسی کی

ہے آدمی آدمی کا قاتل
یہ بھی تو ہے شکل خودکُشی کی

وہ جس نے دیئوں سے بیر رکھّا
اب اُس کو طلب ہے روشنی کی

ہر راہ پہ چل رہی ہے دنیا
ویران ہے راہ راستی کی

ہر فصل کے بیج بونے والو
اِک فصل ہے امن و آشتی کی

شاید وہ خود آدمی نہیں ہے
توہین کرے جو آدمی کی

ایسا بھی تھا اِک چراغ جس نے
بجھ کر بھی دلوں میں روشنی کی

کیوں موت سے بھاگتی ہے دنیا
اِک شکل ہے یہ بھی زندگی کی

دشمن بھی تو رہ سکا نہ دشمن
خُو ایسی رکھی ہے دوستی کی

اِک لفظِ وفا جو ہے لغت میں
روداد ہے میری زندگی کی

مجھ کو تو عزیز ہیں اندھیرے
پہچان ہے اِن سے روشنی کی

مشکل سے غزل ہوئی ہے باقرؔ
آساں تھی زمین مصحفیؔ کی

(۲۲ جنوری ۱۹۹۰ء بمقام کراچی)

○

حال ناسازگار بھی تو نہیں
پر دلوں کو قرار بھی تو نہیں

کوئی کچّے گھڑے پہ کیا تیرے
عشق دریا کے پار بھی تو نہیں

اپنی مٹّی کو چھوڑنے والے
بے سبب بے دیار بھی تو نہیں

مرگِ انبوہ جشنِ عام بنا
اب کوئی سوگوار بھی تو نہیں

اہلِ دولت کی مفلسی توبہ
پاس کچھ اعتبار بھی تو نہیں

کیا ٹھکانہ ہے اُس کی خلقت کا
ایک شئے پائیدار بھی تو نہیں

حسرتیں کیوں شمار کرتے ہو
خواہشوں کا شمار بھی تو نہیں

ہارنا چاہتے ہیں دِل اپنا
اپنی قسمت میں ہار بھی تو نہیں

سینے پہ لے لیے جو تیر چلے
پشت پر کوئی وار بھی تو نہیں

دھوپ ہے جس طرف نظر جائے
اِک شجر سایہ دار بھی تو نہیں

(۲ دسمبر ۱۹۹۲ء)

○

دِل سے دِل کو ملائیے صاحب
ہم کو اپنا بنائیے صاحب

قربتوں میں یہ فاصلے کیسے
اور نزدیک آئیے صاحب

ہم بھی مانوس ہیں محبت سے
دست الفت بڑھائیے صاحب

زندگی مختصر ہے خوش رہیے
غم سے پیچھا چھڑائیے صاحب

کچھ تو ماحول خوشگوار بنے
کوئی جادو جگائیے صاحب

ہم کو آتا ہے ڈھب منانے کا
جائیے روٹھ جائیے صاحب

روٹھ کر آپ کیسے لگتے ہیں
اپنی صورت دکھائیے صاحب

جی میں جو آئے شوق سے کیجئے
دِل مگر مت دکھائیے صاحب

تھک گئے دِل لگا کے اوروں سے
اب ہمیں آزمائیے صاحب

اِس قدر خامشی تو ٹھیک نہیں
کچھ تو سنیئے سنائیے صاحب

راستی کا جو ایک رستہ ہے
کبھی اُس پر بھی جائیے صاحب

ہم ہر اِک امتحاں سے گزرے ہیں
ہم کو مت آزمایئے صاحب

سانسیں بے چین ہونے لگتی ہیں
پاس اتنا نہ آیئے صاحب

آپ کی قربتیں قیامت ہیں
آگ تو مت لگایئے صاحب

آگ بڑھ کر کہاں تک آ پہنچی
اپنا دامن بچایئے صاحب

کون اپنا ہے اِس زمانے میں
کس کو اپنا بنایئے صاحب

○

ہم نے بھی اِک کام کیا ہے
حُسن کو دِل کا دان دیا ہے

سنتے ہیں کہ سچ کی خاطر
دِل والوں نے زہر پیا ہے

گوری کو یہ خوب خبر ہے
کون ہے بیری کون پیا ہے

میرا اندر سب ہے روشن
جلنے والا دِل کا دیا ہے

جس سے ہے سیراب زمانہ
حرفِ سخن ایسا دریا ہے

ہم جانیں اور داتا جانے
اُس نے دیا ہے ہم نے لیا ہے

دشتِ جنوں کے بسنے والو
چاک گریباں کس نے سیا ہے

سب ہیں اِس دھرتی کے باسی
کوئی پرانا کوئی نیا ہے

ہجر کا جو لمحہ تھا قیامت
وہ بھی آخر بیت گیا ہے

دِل کو سلامت رکھے مولا
روز جیا ہے روز مرا ہے

دِل کی باتیں دِل ہی جانے
کون آیا ہے کون گیا ہے

روپ نگر کے چندر مکھڑے
تو نے تو دِل موہ لیا ہے

کتنی آسانی سے تم نے
مشکل کو آسان کیا ہے

دِل میں کسی کے رہتے ہیں باقر
اُن کا بھی تو ایک ٹھیا ہے

(ناصر کاظمی کی بحر میں)

○

کیا عجب بات ہو گئی سائیں
نفی اثبات ہو گئی سائیں

آپ کو ہم نصیب کیا ہوتے
کچھ کرامات ہوگئی سائیں

آپ کی اِک نظر محبت کی
ہم کو سوغات ہوگئی سائیں

ایک دو تین چار سے مری قدر
پانچ چھ سات ہوگئی سائیں

جوڑا جب کُھل گیا تو دھوپ کہاں
دیکھئے رات ہوگئی سائیں

وقت کے بے کراں تسلسل میں
صدی لمحات ہوگئی سائیں

جانے کب دن گزر گیا میرا
جانے کب رات ہوگئی سائیں

دِل ہر اِک امتحاں میں جیت گیا
عقل کو مات ہوگئی سائیں

زلف و عارض کی دھوپ چھاؤں میں
گزر اوقات ہوگئی سائیں

کب سے اُمڈے تھے درد کے بادل
رات برسات ہوگئی سائیں

اتنے بَل کیوں جبیں پہ آئے ہیں
کیا کوئی بات ہوگئی سائیں

شاعری کارِ بے ہنر بن کر
اِک خرافات ہوگئی سائیں

کوئی وعدہ نہیں ہوا پورا
کچھ نہ کچھ بات ہوگئی سائیں

ہم تو سمجھے تھے اُن کو بھول گئے
پھر ملاقات ہوگئی سائیں

○

موسموں کی تبدیلی جس کی دسترس میں تھی
گلستاں کی رعنائی ، بس اُسی کے بس میں تھی

سب جنوں فراوانی قیس ہی کے بس میں تھی
وہ روش محبت کی سو میں تھی نہ دس میں تھی

گُل بدوش موسم تھے چاہتوں کی بستی میں
اُس کے لمس کی لذت جب نَفَس نَفَس میں تھی

تلخیٔ زمانہ بھی شہد و قند لگتی تھی
کس بلا کی شیرینی اُن لبوں کے رَس میں تھی

بے حساب رنگوں میں بے شمار چہرے تھے
کیا کہوں کہ کیا وسعت دِل کے کینوس میں تھی

اُس کے ہجر کے لمحے کیا گراں گزرتے تھے
اب کہاں وہ بے تابی جو گئے بَرَس میں تھی

جلتے آشیانے سے پھول سے برستے تھے
کس غضب کی زیبائی اپنے خار و خس میں تھی

ظلم و جبر کی قوّت جس نے خاک کر ڈالی
صبر کی وہ طاقت بس بے کسوں کے بس میں تھی

جیسا کام ہوتا ہے ویسا زور ملتا ہے
ہمتوں کی ارزانی کوہ کَن کے جَس میں تھی

مندروں کی ، مسجد کی ، دَہر کی ، کلیسا کی
کچھ شناخت برجوں میں ، کچھ چھپی کلَس میں تھی

اُس کی یاد میں باقرؔ رنگ تھے محبت کے
ہم بھی اور کیا کرتے اِک غزل ہی بس میں تھی

○

انسان کی حیات میں عرصہ قرار کا
حسبِ طلب کسی کے نہیں اختیار کا

وہ دُور ہوگیا تو خزاں بن گئی بہار
وہ پاس آگیا تو ہے موسم بہار کا

ہم خوش نصیب ہیں کہ حسینوں کے دِل میں ہیں
کرتے ہیں شکر نعمتِ پروردگار کا

یارو یہ عشق بھی تو عجب طرح کا ہے کھیل
جیتے ہوؤں کو جس میں مزہ آئے ہار کا

گردن میں ڈال دیجئے بے ساختہ کبھی
دِل منتظر ہے آپ کی بانہوں کے ہار کا

وہ چودھویں کی شب ، وہ لباسِ کتاں کا حُسن
لطف آرہا ہے پیرہنِ تار تار کا

جو مسکرا کے دیکھ لے یہ دِل اُسی کا ہے
میرا ہے ، پر نہیں ہے مرے اختیار کا

بس خاکساریوں میں بسر ہوگئی حیات
دامن نہ چھوڑا ہم نے کبھی انکسار کا

کُنجِ لحد میں آج ہوں محتاجِ فاتحہ
کہتا ہے سب سے یہ مرا پتھر مزار کا

دنیا میں ہر جگہ ہیں محبت کی کوششیں
ہم ہیں کہ ایک لفظ بھی بھاری ہے پیار کا

باقرؔ غزل سلام اُسے اب بھی کرتی ہے
جو رہنے والا تھا کسی اُجڑے دیار کا

○

کچھ محبت کا مان چاہتی ہے
جسم کا لمس جان چاہتی ہے

بوئے الفت کا دان چاہتی ہے
کشتِ غم زعفران چاہتی ہے

رفعتِ آسماں بھی کم ہے اُسے
فکر اُونچی اُڑان چاہتی ہے

حُسنِ لفظ و بیاں ضروری ہے
شاعری تو زبان چاہتی ہے

اپنا گھر اب کسی کے دِل میں نہیں
بے گھری اِک مکان چاہتی ہے

جو سنے وہ کہے اُسے لبیک
کم سے کم یہ اذان چاہتی ہے

اِس قدر انکسار ٹھیک نہیں
کسرِ نفسی بھی آن چاہتی ہے

نیند آئے تو کس طرح آئے
زندگی اطمینان چاہتی ہے

طاقتِ ظلم جنگ پھیلا کر
دہشتوں سے امان چاہتی ہے

ساتویں آسماں پہ پہنچا دماغ
یہ چڑھائی ڈھلان چاہتی ہے

دھوپ بھی دھوپ میں جلے کب تک
رات کا سائبان چاہتی ہے

دِل کو آسانیاں نہیں منظور
عاشقی امتحان چاہتی ہے

جتنا گر سکتی تھی گری دنیا
اب یہ پستی اُٹھان چاہتی ہے

ولولوں کو جوان رکھنا ہے
کُند تلوار سان چاہتی ہے

عاشقی کا مزاج ہے کچھ اور
یہ الگ ہی جہان چاہتی ہے

کیسی نایابیاں ہیں قوم اب بھی
روٹی ، کپڑا ، مکان چاہتی ہے

بدگمانی کے عہد میں باقرؔ
بے یقینی گمان چاہتی ہے

O

میرے دِل میری جان میں آیا
لا مکاں کس مکان میں آیا

حُسن جب آن بان میں آیا
دِل بڑے امتحان میں آیا

تم نے جب مسکرا کے دیکھ لیا
جانے کیا کیا نہ دھیان میں آیا

تھا وہ کس خوش نصیب کا ماتم
نیل کس طرح ران میں آیا

اب زباں میری کون پکڑے گا
کہہ دیا جو زبان میں آیا

اُس کو شعروں کی سوجھ بوجھ رہی
جو مرے خاندان میں آیا

دھوپ جب چار سَمت پھیل گئی
سایہ بھی سائبان میں آیا

وہ مرے دِل میں اِس طرح آیا
جیسے گاہک دُکان میں آیا

جو قبیلے میں اہلِ دِل نکلا
وہ مرے کاروان میں آیا

بے یقینی سی بے یقینی ہے
جو بھی آیا گمان میں آیا

اب نتیجہ کی فکر کون کرے
تیر چلّے کمان میں آیا

حُسن اور عشق کے جھمیلوں میں
کون کس کی امان میں آیا

اُس میں پھر قیس سا نہ آیا کوئی
قیس جس خاندان میں آیا

میرے دِل میں جو آگیا باقؔر
عافیت کے جہان میں آیا

○

تنگ ہیں اپنے ہی کلام سے ہم
جانے جاتے ہیں اپنے نام سے ہم

پیار کرتے تھے ، پیار کرتے ہیں
کام رکھتے ہیں اپنے کام سے ہم

درگزر دشمنوں سے کرتے ہیں
دُور رہتے ہیں انتقام سے ہم

سب کے دِل اپنے دِل میں رکھتے ہیں
سب سے ملتے ہیں احترام سے ہم

دن میں آوارہ گرد پھرتے ہیں
گھر میں رہتے ہیں اپنے، شام سے ہم

راستہ، راستی کا چلتے ہیں
بچے رہتے ہیں اژدہام سے ہم

اپنی قسمت پہ فخر کرتے ہیں
مقتدی ہیں تو ہیں امام سے ہم

کیوں گزرتے ہو اجنبی کی طرح
کیا گئے اب دعا سلام سے ہم

ہم فقیروں کا ہے الگ انداز
مختلف بھی ہیں خَلقِ عام سے ہم

کیا عبث زندگی گزاری ہے
اب بھی لگتے ہیں ناتمام سے ہم

○

جب محبت کے سلسلے نکلے
کیا برے لوگ ، کیا بھلے نکلے

دُور سب ہوگئے گِلے آخر
ہم سے مِل کر جو وہ گلے نکلے

اُس کو روزی بھی کم ہی ملتی ہے
گھر سے اپنے جو دِن ڈھلے نکلے

وہاں ٹکتے نہیں زمیں پہ قدم
جہاں پانی گلے گلے نکلے

آدم و حوّا باغِ جنّت سے
چاہتے تو نہ تھے وَلے نکلے

عزّتیں جن کو جاں سے پیاری تھیں
سُرخ رُو تیغ کے تلے نکلے

جب سخن نے کیا معاش کا کام
کیا غزل نکلی ، کیا گلے نکلے

دہر کے پہلے قاتل و مقتول
ایک ہی گود کے پلے نکلے

رونقیں ساری ساتھ لے کے اُٹھے
جب بھی محفل سے منچلے نکلے

مے کدے میں اذان دیتے ہیں
شیخ صاحب تو باؤلے نکلے

طبعِ موزوں کی خیر ہو باقرؔ
سارے مصرعے ڈھلے ڈھلے نکلے

○

خالقِ حُسن کی نعمت کے طلبگار ہیں ہم
حُسن جس رنگ میں ہو طالبِ دیدار ہیں ہم

جو سہاروں سے ٹِکا ہے وہ ہمارا ہے وجود
یہ حقیقت ہے کہ گرتی ہوئی دیوار ہیں ہم

ہم کسی اور کو اپنا سا سمجھتے ہی نہیں
آپ ہی اپنی کسوٹی ہیں، وہ معیار ہیں ہم

اپنی خود ساختہ جنّت کے ہیں باسی ہم لوگ
بے عمل ہی سہی پر غازیٔ گفتار ہیں ہم

اپنی کہتے ہیں کسی اور کی سنتے ہی نہیں
کس قدر اپنی اَناؤں میں گرفتار ہیں ہم

سستے داموں ہی بڑے شوق سے بِک جاتے ہیں
کوئی گاہک تو ملے جنسِ خریدار ہیں ہم

ہم وہ تنہا ہیں کہ ہمدرد کوئی جس کا نہیں
کیا زمانہ ہے کہ بے یار و مددگار ہیں ہم

اپنے جیسا تو کوئی اور مسلماں ہی نہیں
دہشت و قتل سے جنّت کے طلبگار ہیں ہم

ڈھونڈیے ہم میں کبھی عظمتِ رفتہ کے نشاں
اب بھی جو خیر سے باقی ہیں وہ آثار ہیں ہم

بے خطا مارنے والوں کو جو کہتے ہیں شہید
اُن مسلمانوں سے سچ یہ ہے کہ بیزار ہیں ہم

○

اب تو ایسی کوئی گھڑی آئے
حُسن کو خود سپردگی آئے

اب ہمیں دے گی کیا مزہ یہ شراب
ہم تو آنکھوں سے اُس کی پی آئے

دشمنوں سے بھی راہ و رسم بڑھائیں
دوستوں میں جو کچھ کمی آئے

دِل کے آنگن میں کچھ اندھیرا ہے
کسی مکھڑے کی روشنی آئے

اِس طرح آ رہا ہے دِل کا مکیں
جس طرح کوئی اجنبی آئے

کام تو ہم سے ہو سکا نہ کوئی
کر کے باتیں بڑی بڑی آئے

اُس کی محفل میں بیٹھنے سے ہمیں
کچھ تو آدابِ بندگی آئے

اپنی سب ہی سے ہے سلام و دعا
رند آئے کہ مولوی آئے

اور سب ہو مگر خدا نہ کرے
نیکی بَن کر کوئی بدی آئے

حُسن والے مکیں ہوں جب دِل میں
کس طرح پاک دامنی آئے

اپنے قصّے ڈھکے چھپے تو نہیں
جو بھی آئے ہنسی خوشی آئے

جب خموشی زبان بنتی ہے
ایسی چُپ تو گھڑی گھڑی آئے

زندگی تو نصیب ہی میں نہ تھی
ہاں مگر عمر ساری جی آئے

کاش اِن حُسن کے خداؤں کو
تھوڑی سی بندہ پروری آئے

حُسن والوں کی بھیڑ ہے بیکار
کوئی ایسا ہو جس پہ جی آئے

غالبؔ و میرؔ بن رہے ہیں لوگ
شعر سمجھیں نہ شاعری آئے

جب حَسیں ہوں کنارہ کش باقرؔ
پھر تو اچھا ہے موت ہی آئے

○

خواب ملتے نہیں جب وقت کی تعبیر کے ساتھ
دِل اُمنڈ آتے ہیں خود درد کی تاثیر کے ساتھ

یہ الگ صِنف ہے، ہیں اِس کے تقاضے کچھ اور
نعت لکھو تو لکھو قلب کی تطہیر کے ساتھ

خودکُشی موت ہے، یہ کوئی شہادت نہ جہاد
وہ شہادت ہے جو ہو اُسوۂ شبیرؑ کے ساتھ

یہ ضروری تو نہیں حق کا بھی منشا ہو وہی
کتنے مفہوم بدل جاتے ہیں تفسیر کے ساتھ

ہم وہ قیدی ہیں جو مر کر بھی نہ آزاد ہوئے
ہم کو دفنایا گیا پاؤں کی زنجیر کے ساتھ

بات سچّی ہے کہ قسمت کا لکھا سچ ہے مگر
آپ تقدیر بدل سکتے ہیں تدبیر کے ساتھ

کتنے دانشور و نقاد و ادیب و شاعر
مَر کے بھی زندہ ہیں اپنی اِسی توقیر کے ساتھ

کچھ ہماری ہی طرح ہجر کے مارے ہوئے لوگ
گفتگو کرتے ہیں محبوب کی تصویر کے ساتھ

واعظِ شہر کی باتیں ہیں دِل آویز مگر
اُس کا کردار تو ملتا نہیں تقریر کے ساتھ

ہم تو شاعر تھے ہمیں کس کا گلہ کرنا تھا
ہم اندھیروں میں رہے فکر کی تنویر کے ساتھ

○

جب حُسنِ طلب لذتِ گفتار میں رکھنا
پندارِ اَنا دستِ طلب گار میں رکھنا

نفرت میں کہیں اور کہیں پیار میں رکھنا
دِل ایک ہے سو طرح کے آزار میں رکھنا

چاہو جو قدم جادۂ دشوار میں رکھنا
دِل اپنا کسی یارِ طرح دار میں رکھنا

اب خوبیِ کردار ضروری بھی نہیں ہے
سب عزّ و شرف منصب و دستار میں رکھنا

جو بات ہو دِل میں وہی آئے بھی زباں پر
ہاں حفظِ مراتب لبِ گفتار میں رکھنا

اِک دن یہی بن جائے گا پہچان تمھاری
انداز جدا سب سے تم اشعار میں رکھنا

آزاد تو ہیں خانہ بدوشی کی فضائیں
کیا گھر کو اٹھا کر در و دیوار میں رکھنا

○

ترس رہی تھی جبیں سنگِ آستاں کے لیے
مگر جُھکی اُسی در پر بنی جہاں کے لیے

جو پیڑ دھوپ میں جلتے ہیں چھاؤں دیتے ہیں
مثال کوئی اگر ہے تو یہ ہے ماں کے لیے

سنا ہے اب کے یہی بات رہزنوں نے کہی
کہ راہبر تو ضروری ہے کارواں کے لیے

تمھاری ایک جھلک کا جواب بھی تو نہیں
دھنک نے رنگ بکھیرے تھے آسماں کے لیے

حسیں رہیں نہ دِلوں میں تو پھر کہاں جائیں
کہ یہ مکیں تو بنے ہیں اِسی مکاں کے لیے

حصارِ حُسن میں کیا کیا عجیب منظر تھے
نگاہِ شوق نے بوسے کہاں کہاں کے لیے

یہاں مذاقِ نظر غسلِ آفتابی ہے
نہیں ہیں چاند بدن چادرِ کتاں کے لیے

یونہی تو ہر کوئی شیریں سخن نہیں ہوتا
لبوں کا قند ہو شیرینیٔ زباں کے لیے

سبھی نے شعر کہے نذرِ غالبؔ و اقبالؔ
صلائے عام تھی یارانِ نکتہ داں کے لیے

ابھی سے تھک گئے تم راہِ عشق میں باقرؔ
نہ جانے کتنا سفر ہو نہیں سے ہاں کے لیے

○

بہت دنوں سے کوئی دِل کی دھڑکنوں میں نہیں
بُتوں کا پوجنے والا برہمنوں میں نہیں

گداز دِل ہے ، دِلوں کو جو موہ لیتا ہے
کہ گسرِ شان تو بے کار طنطنوں میں نہیں

عُدو وہ تھے بھی تو پیچھے سے وار کیوں کرتے
یہ دوستوں کی رَوِش ہے جو دشمنوں میں نہیں

دنوں میں دُھوپ ہو، اختر شماریاں شب میں
یہ راحتیں بھی تو اب گھر کے آنگنوں میں نہیں

انھیں سے آتا ہے راہِ حیات پر چلنا
وہ کون ہے جو زمانے کی الجھنوں میں نہیں

یہی دِلوں کا تعلق تو ہے خدا کو پسند
وہ بدنصیب ہے جو دِل کے بندھنوں میں نہیں

کُھلے رہیں گے تو سورج بھی اِن سے آئے گا
کہ روشنی کی رَسَد ، بند روزنوں میں نہیں

○

اُس کی چاہت کا اثر اچھا لگا　　شعر کہنے کا ہنر اچھا لگا
جانے کیوں وہ ہر نظر اچھا لگا　　دُکھ تو دیتا تھا مگر اچھا لگا
زندگی تنہا بھلا کس کام کی　　ہم سفر آیا سفر اچھا لگا
اپنا گھر کیا تھا در و دیوار تھے　　وہ جو گھر آیا تو گھر اچھا لگا
اپنے سر لیتا ہے تیزی دھوپ کی　　ٹھنڈی چھاؤں میں شجر اچھا لگا
مُسکرائے تم تو دنیا کِھل اٹھی　　پھر تو ہر اِک خشک و تر اچھا لگا
جب کوئی حیوان دیکھا باوفا
آدمی سے جانور اچھا لگا

○

جس کی قربت کا مرے قلب میں ارماں ہے بہت
وہ تو نظریں بھی ملانے سے گریزاں ہے بہت

اُس کی رگ رگ سے عیاں حُسنِ فراواں ہے بہت
دیکھیئے اُس کو تو پھر کارِ دل و جاں ہے بہت

جس کے جلووں سے مرے دِل میں چراغاں ہے بہت
میری باتوں سے وہی شخص پریشاں ہے بہت

اُس کے پیراہنِ سادہ میں بلا کی ہے کشش
اُس کی بے رنگی میں بھی رنگ کا ساماں ہے بہت

وہ نہیں جانتا ، وہ کیا تھا گذشتہ شب کو
آئینے نے اُسے دیکھا ہے تو حیراں ہے بہت

اُس کے اندام کے خاموش بیانوں پہ نہ جا
زلفیں برہم تو ہوں ، وہ حشر بہ ساماں ہے بہت

اُس سے دوری ہو تو مشکل ہے بہت ہر مشکل
اُس کی قربت جو میسّر ہو تو آساں ہے بہت

جس کو مل جائے اُسے پھر کوئی خواہش نہ رہے
دل کے ہر درد کا وہ ایک ہی درماں ہے بہت

اُس کے ہونٹوں کی عطا ہیں یہ غزل کے مصرعے
دل کی الجھن کے لیے کاکُلِ پیچاں ہے بہت

وہ کسی بحال نہیں چاہتا ہم سے کوئی ربط
اور ہم ہی پہ اُسی شخص کا احساں ہے بہت

وہ جو ہوتا ہی نہیں تنگ لباسی کا شکار
میری نظروں سے جو دیکھو تو وہ عریاں ہے بہت

نہ سہی وصل مگر کوئی تعلق تو رہے
اُس کی قربت کی کوئی صورتِ امکاں ہے بہت

پھر عبادت میں کوئی لطف کہاں سے آئے
ہم گنہ گار ہیں اور لذتِ عصیاں ہے بہت

پیٹ میں آنت نہیں منہ میں ترے دانت نہیں
پھر بھی اے شیخ تجھے خواہشِ خوباں ہے بہت

ہم سے کافر کو بھی اِس کا تو یقیں ہے باقرؔ
وہ مسلماں ہی سہی دشمنِ ایماں ہے بہت

(۲۰ اگست ۲۰۰۹ء)

○

شہر ایک ایسا دیکھا ہم نے جس میں تھے بازار بہت
دِل کا گاہک ایک نہ نکلا جسموں کا بیوپار بہت

انسانوں کی محفل میں بھی رہتے ہو بیزار بہت
قریۂ جاں میں بس کر دیکھو اِس بستی میں پیار بہت

پاس جو ہے یہ حُسن کی دولت سینت کے کب تک رکھو گے
تھوڑی سی خیرات نکالو دے گا پالنہار بہت

اور کسی کو کیا سمجھانا تم سمجھو تو بات بھی ہے
تم سے وہی کہنا ہے جس کا کہنا ہے دشوار بہت

سنگ ملامت ، دشت نوردی ، چڑھتا سورج ، کچّا گھڑا
دِل والوں کی ہمت دیکھو ، ایسے بس دو چار بہت

کچّے گھڑے کی بات نہ پوچھو، آج بھی اُس کے چرچے ہیں
کوئی کسی کا نام نہ جانے اترے دریا پار بہت

سطحِ آب پہ کیا رکھا ہے تہہ تک پہنچو پاؤ گے
گہرے سمندر بھرے پڑے ہیں اُن میں دُرِ شہوار بہت

واعظ کو کیسے سمجھائیں عشقِ بتاں کچھ کھیل نہیں
یہ رستہ بھی چل کر دیکھے بنتا ہے ہشیار بہت

بازی گہہِ طفلاں تو نہیں ہے دِل والوں کی محفل ہے
اِس کا ہر دستور نرالا جیت میں بھی ہے ہار بہت

ہم میں کہاں یہ تاب یہ طاقت ہم سے کہاں اُٹھ پائے گا
بس ہم پر احسان نہ کرنا ، احسانوں کا بار بہت

جس بستی میں گھر جلتے ہیں لاشیں خون میں ڈوبی ہیں
اُس بستی کی بات نہ پوچھو ، رَشی مُنی اوتار بہت

اُس بستی کے گھر نہ جلاؤ ، جس بستی میں رہتے ہو
خون کی ہولی کھیلنے والو تم بھی رہو گے خوار بہت

باقر صاحب بات یہ کیا ہے ، پہلے آپ ایسے تو نہ تھے
کوئی نئی چاہت تو نہیں ہے لکھتے ہو اشعار بہت

(۲۶ اپریل ۱۹۸۷ء بمقام کوئٹہ)

○

خود اجل زیست کی حفاظت ہے　　زندگی موت کی امانت ہے
سوچنا کچھ ، بیان کچھ کرنا　　یہ بھی افکار کی خیانت ہے
یہ کسی کے اگر نہ کام آئی　　پھر تو یہ زندگی اکارت ہے
پُرسشِ حال وہ کرے تو کہیں　　آپ کا لطف ہے، عنایت ہے
ہجر ہی ہجر میری قسمت کیوں　　زندگی وصل سے عبارت ہے
کِس قیامت کی بات کرتے ہو　　یار کا روٹھنا قیامت ہے
فرق ترتیبِ حرف میں ہے فقط　　جو قرابت ہے وہ رقابت ہے
کیوں ہیں سُود و زِیاں کے انداز ے　　پیار بھی کیا کوئی تجارت ہے

یہ مسلسل فراق کے لمحے
کیا یہی آپ کی رفاقت ہے

(اگست ۱۹۸۷ء بمقام کوئٹہ)

مُتفرّق اشعار

کیا جلد قسم ٹوٹ گئی دیکھیئے اُس کی
جو ہم سے نہ ملنے کی قسم کھا کے گیا تھا

.....

وہ مری نظر سے نہاں سہی، مرے دِل میں اُس کا جمال ہے
مجھے اور کیا بھلا چاہیے ، وہ فراق ہے یہ وصال ہے

.....

تم اچھے مسیحا ہو اُس وقت تو آجاتے
بیمار کے سر کو جب زانو کی ضرورت تھی

.....

اُس کے چہرے کے خدوخال بنیں گے کیسے
خود مصوّر بھی تو تصویر ہوا جاتا ہے

.....

حدیثِ دِل ہے تو ہر حال میں سنانی ہے
کچھ اور بَن نہیں پڑتا تو شعر کہتے ہیں

.....

یہ حُسن و عشق کے جھگڑے نہ جانے کب سے برپا ہیں
چلو قصّہ چکادیں آج ، ہم جیتے نہ تم ہارے

.....

شکر کرو اِس شہر میں ایسا کوئی تو ہے
جس سے ملتے رہنے کو جی چاہتا ہے

.....

رُوپ سرُوپ کے سُندر بَن کی سج دھج دلہن جیسی
مَن سونے کا ، تَن چاندی کا ، گوری چَندَن جیسی

.....

بس اب تو ہم بھی اِسی منصفی کے قائل ہیں
کہ جس نے قتل کیا ، خوں بہا بھی اُس کو ملے

.....

جہاں پہ رات ہوئی سو رہے وہیں پڑ کر
کہیں یہ خانہ بدوشی کی زندگی تو نہیں

راستے بند ہیں صورت نئے آزار کی ہے
اب تو در کی وہی صورت ہے جو دیوار کی ہے

....

حُسنِ بیدار کی تو بات ہی کیا
حُسنِ خفتہ بھی اِک قیامت ہے

....

اپنی شاخوں سے بچھڑنے کا سبب ہوتے ہیں
پتّے گرنے کے یہ موسم بھی عجب ہوتے ہیں

....

سَلب ہوتی تھی جہاں قوّتِ گویائی بھی
آج اُس بزم میں کچھ دادِ سخن پائی ہے

....

ہم اُس دیار میں جاکر کہیں نہیں رہتے
جہاں مکان ہیں خالی مکیں نہیں رہتے

....

محبتوں کے زمانے گزر بھی جاتے ہیں
چڑھے ہوئے ہوں جو دریا، اتر بھی جاتے ہیں

ہاتھ میں تیغ نہ کاندھے پہ سپر رکھتے ہو
پھر بھی کہتے ہو کہ جینے کا ہنر رکھتے ہو

....

یہ ایک قطرے کی وسعت ، یہ ظرف کا عالَم
کہ عکسِ مہر مکمل حبابِ بحر میں تھا

....

حصارِ زلف میں جینے کا سلسلہ بھی نہیں
بہت دنوں سے محبت کا آسرا بھی نہیں

....

مصلحت دیکھ کے بدلے نہ قرائن ہم نے
رات کو رات کہا ، دن کو کہا دن ہم نے

....

ہم تو اِس طرح بھی تجدیدِ وفا کرتے ہیں
روز اِک قرض محبت کا ادا کرتے ہیں

....

نہ پوچھ ہم سے اب اُس انتظار کا عالم
ابھی ابھی وہ گیا ، پھر سے راہ تکنے لگے

اُس سے اب رسم وراہ اتنی ہے
دیکھنا اور مسکرا دینا

....

ہم اگر عرضِ حال کردیتے
آپ جینا محال کر دیتے

....

ہم یہ سمجھے تھے بھول بیٹھے ہیں
پھر ستانے لگا خیال ترا

....

وہ ہم سے پوچھ رہے تھے ہمارے بارے میں
تمھارا نام نہ لیتے تو اور کیا کرتے

....

ٹوٹ کر آ گیا آغوش میں یوں جانِ بہار
جس طرح شاخ سے پکّا ہوا پھل گرتا ہے

(میرا پہلا شعر)

بہا نہ تربتِ بیکس پہ اشک او ظالم
غرورِ حُسن ملا جا رہا ہے مٹّی میں

اپنی ایک سالگرہ پر عذرا کاظمی کی طرف سے آئی ہوئی تحریرِ تبریک کے جواب میں

ایسے بھی لوگ ہیں زمانے میں
جن سے دنیا حَسین لگتی ہے

.....

(امریکہ کے شہر سنسناٹی کی بزمِ اردو کے لیے)

دُور باغوں سے پھول چُنوا کر خوب پھیلا دیا ہے خوشبو کو
یا الٰہی نظر نہ لگ جائے سَنسَناٹی کی بزمِ اردو کو

.....

قطعات

جیسے اب کوئی رسم و راہ نہیں
بے خطا بے قصور بیٹھے ہیں
چاند کے آس پاس ہیں تارے
آپ کیوں اتنی دور بیٹھے ہیں

.....

کچھ اور کیجیے یہ عنایت نہ کیجیے
للہ ہم سے اتنی محبت نہ کیجیے
ایسا نہ ہو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑیں
تسکینِ اضطراب کی زحمت نہ کیجیے

.....

اتنی تنہائی کی راتوں میں ترے شہر سے دور
شب گزرتی ہے مگر نت نئی گھاتیں کرتے
دوست ملتا کہ نہ ملتا ، کوئی دشمن ملتا
جو بھی ملتا ہم اُسی سے تری باتیں کرتے

.....

ادھوری رہ گئی اپنی خوشی اِس کامیابی پر
کوئی تسکین کی صورت جو پالیتے تو خوش ہوتے
گلے ملتے رہے احباب سب فرطِ مسرت سے
یونہی تم بھی مبارک باد دے دیتے تو خوش ہوتے

.....

تسکینِ اضطراب پہ مائل ملا تو ہے
برسوں کے انتظار کا حاصل ملا تو ہے
شاید اب اپنا عزمِ سفر کامیاب ہو
اِک شخص اعتبار کے قابل ملا تو ہے

.....

بستی میں قتلِ عام مکرر ہے دوستو
جینا اِسی فضا میں مقدر ہے دوستو
اہلِ چمن کے خوں سے چمن لالہ زار ہے
ایک اور انقلاب مقرر ہے دوستو

.....

دوستی کا صلہ نہیں دیتے
اپنے دِل کی ہوا نہیں دیتے
دوستوں سے توقعات نہ رکھ
دوست تو راستہ نہیں دیتے

وقت آئے تو ٹل نہیں سکتا
گرنے والا سنبھل نہیں سکتا
وقت جو فیصلہ سناتا ہے
اُس کو کوئی بدل نہیں سکتا

.....

حُسن کے طور دیکھتے رہیے
دیکھیے اور دیکھتے رہیے
ہم کراچی میں مر بھی جائیں تو کیا
آپ لاہور دیکھتے رہیے

.....

کیا خوب ہیں دوستی کے رشتے
دانستہ قریب آ رہے ہیں
وہ ہے کہ فریب دے رہا ہے
ہم ہیں کہ فریب کھا رہے ہیں

.....

تمھاری طرح نہ ہوں پر عجب نہیں ہم لوگ
چراغِ شب ہیں یونہی بے سبب نہیں ہم لوگ
زمانہ ہم کو حقارت سے دیکھتا کیسے
کہ کم نصیب سہی، کم نسب نہیں ہم لوگ

زنداں نہیں دیکھے کہ سلاسل نہیں دیکھے
خونی نہیں دیکھے کہ مقاتل نہیں دیکھے
نسلوں کی تباہی پہ پشیماں بھی نہیں ہیں
آگے کہیں اِس وضع کے قاتل نہیں دیکھے

.....

نظر اُٹھتی ہے سب ہی کی سبھی پر
تو جو جیسا ہے ، وہ لگتا ہے ویسا
مگر ہٹتیں نہیں اُس سے نگاہیں
اِنہیں لگتا ہے جو بھی سب سے اچھا

.....

لذتِ گفتار

اک کتابِ غمِ دل بھی سرِ بازار ملی
چلیے ہمراہوں کی رفتار سے رفتار ملی
بات کرنے میں تکلّف رہا جن کو ہم سے
اُن کے ہاتھوں میں ہمیں ''لذتِ گفتار'' ملی

.....

فراتِ سخن

رضائے حق سے ہے توفیقِ التفاتِ سخن
غمِ حسینؑ ہے تہذیبِ کائناتِ سخن
یہ مرثیے ہیں ولائے حسینؑ کا صدقہ
ملی ہے تشنہ لبوں سے مجھے ''فراتِ سخن''

حرمتِ حرف

سب کی قسمت نہیں ہے خدمتِ حرف
قابلِ رشک ہے یہ نسبتِ حرف
چُھو رہی ہے حدودِ کون و مکاں
میرے قد سے فزوں ہے قامتِ حرف

''صد پارہ ہائے دل''

(رضیہ کاظمی کے شعری مجموعہ کا قطعہِ تاریخ)

رکھیے ضرور شوق سے باقرؔ اَنائے دل
دشمن کا بھی مگر کبھی دُکھنے نہ پائے دل

دلداریوں سے کس طرح کوئی بچائے دل
دل کی ہے آرزو ، کسی دل میں سمائے دل

جس کو بھی راس آئی ہو آب و ہوائے دل
دل سے قبول کرتا ہے ، ہر التجائے دل

مشکل سے دل کو ملتی ہے راحت سرائے دل
ہر دل تو وہ نہیں جہاں آرام پائے دل

آخر کہیں، کبھی تو، کسی پر بھی آئے دل
ایسا نہ ہو کہ تھک کے یونہی بیٹھ جائے دل

۲۰۰۷ء
''رضیہ کی شاعری کہو، صد پارہ ہائے دل''
ممکن نہیں کہ اس کو کبھی بھول جائے دل

۲۰۰۹ء
''بھائی ہے آج کچھ تروتازہ فضائے دل''
۱۴۳۰ھ
''کیسا سخن ہے رہزنِ صد پارہ ہائے دل''

ہر ایک دل کا مقصد و منشا یہی تو ہے
بے گھر کبھی نہ ہو، جو کسی دل کو بھائے دل

بے ساختہ وہیں اُسے لبیک کہہ دیا
جب بھی سنی کسی سے کسی کی صدائے دل

دل سے نکل کے جا کے جو چھوتی ہو عرش کو
وہ اور کچھ نہیں ہے وہی ہے دعائے دل

سو غزلوں پر ہوئی ہے جو یہ مشتمل کتاب
کیا خوب نام رکھا ہے 'صد پارہ ہائے دل'

پیکر میں شعر کے ہیں عجب خوش بیانیاں
۲۰۰۹ء
"شیرینیٔ غزل ہے کہ،صد پارہ ہائے دل"

تاریخ کو یہ مصرعِ عالی عطا ہوا
۱۴۳۰ھ
"اہلِ ادب عظیم ہے صد پارہ ہائے دل"

گزرے حیات آلِ محمدؑ کے عشق میں
اِس عمر میں نہ اب کہیں باقرؔ لگائے دل

تمام شب

گزری ہے اِس طرح روشِ غم تمام شب
چھائی رہی فضائے محرم تمام شب

دیکھا کئے جو یادوں کا البم تمام شب
آنکھوں سے مینہ برستا تھا چھم چھم تمام شب

اِس طرح بھی رہیں کبھی باہم تمام شب
جس طرح گنگا جمنا کا سنگم تمام شب

نظمِ جہاں تھا درہم و برہم تمام شب
دِل تھا شریکِ ضربِ دما دم تمام شب

بے پیرہن تھا حُسنِ مجسّم تمام شب
دیدم تمام شب وَ نہ دیدم تمام شب

وہ حُسن یار تھا کہ نگاہوں کی عید تھی
گھر میں تھا میرے اور ہی عالم تمام شب

پھیلی ہوئی تھی چاند سے چہروں کی روشنی
جلتے ہوئے چراغ تھے مدہم تمام شب

برہم تمام شب رہا ایسا مزاجِ یار
ہرنی کی طرح کرتا رہا رَم تمام شب

برکھا کی رُت میں بولتی بوندوں کے شور سے
بجتا رہا ہے کانوں میں سَرگم تمام شب

عارض کی روشنی میں تھیں سایہ کئے ہوئے
زلفیں تھیں رُوئے یار پہ برہم تمام شب

دِل چاہتا تھا پھر کہ کچھ ایسا ملاپ ہو
رہتی ہے جیسے پھول پہ شبنم تمام شب

اُس کی نوازشیں تھیں کہ گرتی تھیں ٹوٹ کر
اور ہم تھے جو کئے رہے سرخم تمام شب

کروٹ بدل کے دوسری جانب وہ سو گیا
پھر کروٹیں ہی لیتے رہے ہم تمام شب

جب چھوڑ کر چلا گیا یادیں تو پاس تھیں
ہر لمحہ ساتھ تھا مرا ہمدم تمام شب

نا محرموں کا شیخ یہاں پر گزر نہیں
آتا ہے وہ جو رہتا ہے محرم تمام شب

کیا درد ہے کہ جس سے دِلوں کے ہیں سلسلے
اہلِ وفا ہیں اور ہے ماتم تمام شب

آنکھیں

سارا سچ ہی سچ ہوتا ہے ، سچ ہی بولیں ہیں آنکھیں
جھوٹ کو کوئی لاکھ چھپائے ، جھوٹ کو کھولیں ہیں آنکھیں

حُسن نکھر کر آجاتا ہے ، اور حَسیں ہوجاتی ہیں
چپکے چپکے اشک بہا کر ، جب وہ دھولیں ہیں آنکھیں

سچّے جذبوں سے نکلیں تو سچّے موتی ہیں آنسو
یاں دولت کا کال نہیں ہے موتی رولیں ہیں آنکھیں

دیدہ و دِل کا ربط تو دیکھو ، جب بھی دِل پر چوٹ لگے
دِل کے درد کا سارا منظر ، خود میں سمولیں ہیں آنکھیں

چاہنے والی آنکھوں سے جب بھی جا کر ٹکراتی ہیں
تَن مَن میں سب دیپ جلا کر اُمرت گھولیں ہیں آنکھیں

دونوں پر یکساں حاوی ہیں ، خواب ہو یا بیداری ہو
بند پپوٹے جاگیں آنکھیں ، کُھلی بھی سولیں ہیں آنکھیں

۲

ایسی کھری ہوتی ہیں یہ کہ کھوٹ کا اِن میں نام نہیں
دِل میں چُھپے بھیدوں کو بتا کر، آنکھیں کھولیں ہیں آنکھیں

جتنی ہو جذبات میں شدّت ، اتنی گہری ہوتی ہیں
سننے والے کان ہوں پیارے، منہ سے بولیں ہیں آنکھیں

نفرت و الفت ،شرم و ندامت ،حزن و ملال و بیم و رجا
جو منظر ہو صاف دکھائیں دِل جو ٹٹولیں ہیں آنکھیں

اِن کی رسائی کہاں نہیں ہے ،کوئی سماں ہو، کوئی مقام
تب تو کہیں ہیں چشمِ تصور، ہر جا ہولیں ہیں آنکھیں

آنسو لے کر دِل کا سارا غبار نکلتے ہیں باقرؔ
جبھی تو سب کی بپتا سُن کر، ہم بھی بگھولیں ہیں آنکھیں

(۱۶ فروری ۱۹۸۹ء بمقام کراچی)

آہ ڈاکٹر سیّد علی مومن

جون کی چھ تھی اور ہفتہ کا دن
گئے دنیا سے ڈاکٹر مومن
اِک صدی کی صدائے جوش وخروش
دارِ مغرب میں ہوگئی خاموش
مومنوں کے نہیں دلوں کو قرار
باغِ مومن میں ہے خزاں کی بہار
ہے رفیقوں میں دردو یاس بہت
قلبِ باقر بھی ہے اداس بہت
اپنے دل کا کہا کرو باقر
قرضِ جاں ہے ادا کرو باقر
خوئی سنٹر میں آج ہے چہلم
سب ہی افسردہ ہیں وہ ہم ہوں کہ تم
دوست اور رشتہ دار جمع ہیں آج
دے رہے ہیں محبتوں کا خراج
ایک قلبِ گداز تھا ، نہ رہا
قوم کا چارہ ساز تھا ، نہ رہا
دانش و آگہی کا نُور تھا وہ
عَصَبیّت سے کوسوں دور تھا وہ
مَن کا سچّا تھا ، دُھن کا پکا تھا
عام اچھوں میں خاص اچھا تھا
ایسا مومن ، کہ جانِ محفل تھا
گھر کی عزّت تھا ، شہر کا دل تھا
تھا اکیلا بھی ایک بزم بدوش
اُس کی پیری شبابِ عزم بدوش
دل سے سیدھی دلوں کو جاتی تھیں
اُس کی باتیں سبھی کو بھاتی تھیں
خوش نظر ، خوش نہاد تھا کہ نہیں
ہمہ تن اجتہاد تھا کہ نہیں

نیکیاں جس کی عادتیں ہوجائیں
اُس کی سانسیں عبادتیں ہوجائیں

۲

کیا غضب زندگی گزاری ہے ہر نفس اِک صدی پہ بھاری ہے
آبرو گھر کی ہوں جو گھر کے بزرگ اب کہاں ایسے کرّ و فر کے بزرگ
اِک الگ آن بان رکھتا تھا کیا بزرگی کی شان رکھتا تھا
اُس میں سب شان تھی بزرگی کی اُس سے پہچان تھی بزرگی کی
صاحبِ علم ، صاحبِ کردار متبسّم ، شفیق ، کوہِ وقار
ہم نے دیکھے ہیں گھاٹ گھاٹ کے لوگ اب کہاں ایسے ٹھاٹ باٹ کے لوگ
زندگی خاص اِک شِعار میں تھی سب ارادوں کے اختیار میں تھی
ایسا مومن کہ گھر میں سب مومن قلب مومن ، حَسب نَسب مومن
خاص میلان کا گھرانہ ہے اہلِ ایمان کا گھرانہ ہے
اور جب خاندان عالی ہو کیوں نہ اخلاق پھر مثالی ہو
گھر میں اخلاص ہے مروّت ہے گھر نہیں ، مومنوں کی جنت ہے
جانشیں اُن کے ہیں حسن مومن ایک پیکر میں روح و تن مومن
یہ تو کچھ اِس طرح کے ہیں مومن دیکھیں کافر بھی تو کہیں مومن
ہے بہو شمع ، روشنی کی سبیل ظلمتیں دور ہیں ، یہ اِس کی دلیل
شمع کے دم سے روشنی ہے یہاں نُور بر دوش زندگی ہے یہاں

یا الٰہی یہ گھر رہے آباد ہوں مکیں اِس کے سارے خرم و شاد
جب بھی مومن وفات پاتے ہیں اچھی اولاد چھوڑ جاتے ہیں
سب ہیں غمگین ، بیٹیاں ، داماد
جانے والے کو کر رہے ہیں یاد

۳

دل پہ یہ جبر کرنا پڑتا ہے کیا کریں صبر کرنا پڑتا ہے
زیست اِس پر تھی منحصر مومن خلد تھی تیری منتظر مومن
کھوٹے سچّے سبھی پرکھ کے گیا اپنا دل سب کے دل میں رکھ کے گیا
اِس جہاں سے نجات ہوتی ہے مرگِ مومن حیات ہوتی ہے
یہی لکھتی تھی اُس کی ہر تحریر مجلسوں سے ہو قوم کی تعمیر
جو سفر تھا اِسی کی راہ میں تھا مقصدِ کربلا نگاہ میں تھا
دور مقصد سے کاش قوم نہ ہو یعنی خالی صلات و صوم نہ ہو
اِس طرح ہو ادا وفاداری رسمِ کہنہ نہ ہو عزاداری
وہ سبھی جو یہاں نہیں ہیں آج سورۂ فاتحہ کے ہیں محتاج
آپ سے بس یہی گزارش ہے
سورۂ فاتحہ کی خواہش ہے

(ڈاکٹر سیّد علی مومن کی رحلت ۶ جون ۲۰۰۹ء کو کیلی فورنیا میں ہوئی۔ آپ کی چہلم کی مجلس منعقدہ ۱۱ جولائی ۲۰۰۹ء الخوئی سنٹر نیویارک میں پڑھی)

وطن

اے وطن تو ہے روح و جاں کی طرح　　رفعتیں تیری آسماں کی طرح
تو امیر و غریب پر یکساں　　سایہ افگن ہے سائباں کی طرح
زندگی کے ہر ایک موسم میں　　تو ہے اِک یارِ مہرباں کی طرح
دُھوپ بھی تیری ٹھنڈی چھاؤں ہے
شفقتیں تیری ایک ماں کی طرح

○

قطعۂ تاریخ

احمد فرازؔ کی وفات پر

اُس کو غزل کی شُوخ مزاجی سے لاگ تھا
وہ اِس کی زندگی تھی، تو یہ اُس کا بھاگ تھا
ہیں دِل نشیں فرازؔ کی شیریں بیانیاں
وہ عام فہم اردو غزل کا سہاگ تھا

۲۰۰۸ء